یکم فروری ۲۰۲۰ء | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | جلد نمبر: ۱۳ ۔ شمارہ نمبر: ۳

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، محمد عمید فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰ (۹۲۔۲۱)

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi. REG No. SC-1303

۱۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے' جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلاتبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون' نقطۂ نظر' خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں' اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۴۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید' لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

امریکی ٹیکنالوجی کی مشرقِ وسطیٰ منتقلی

Frank Vogl - Stephan Richter

دنیا کو آگے چل کر سلامتی کے حوالے سے جو چند بڑے خطرات لاحق ہو سکتے ہیں اُن میں ایک سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کو حساس ہتھیاروں اور آلات کی ٹیکنالوجی کی منتقلی بھی شامل ہے۔

آج کی دنیا جدید ترین ٹیکنالوجی کی مدد سے بنائے جانے والے ہتھیاروں اور متعلقہ ساز و سامان کے حوالے سے مسابقت سے عبارت ہے۔ ہتھیاروں کو زیادہ سے زیادہ جدید اور کارگر بنانے کے معاملے میں یورپ نے بھی بہت محنت کی ہے مگر امریکا اس معاملے میں سب پر بازی لے گیا ہے۔ آج بھی سب سے زیادہ پیچیدہ اور کارگر جدید ہتھیار امریکا ہی بنا رہا ہے۔ دنیا کے سب سے بڑے اسلحہ فروخت کرنے والے ادارے لاک ہیڈ مارٹن، بوئنگ اور رتھیون جیسے بڑے اداروں کو امریکی حکومت نے اجازت دے رکھی ہے کہ سعودی عرب کو اندرون ملک جدید ترین ہتھیاروں کی تیاری کے قابل بنانے کے حوالے سے جدید ترین آلات اور ٹیکنالوجی فراہم کریں۔

سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور دیگر ممالک اگر اپنے ہاں اسلحہ ساز اداروں کو مستحکم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو آگے چل کر وہ اسلحے اور دفاعی آلات کے حوالے سے امریکا پر کم منحصر ہوں گے اور جدید ترین ہتھیار برآمد کرنے کے قابل بھی ہو جائیں گے۔

امریکی کانگریس کی ریسرچ سروس کو ۲۰۱۷ء میں معلوم ہوا کہ متحدہ عرب امارات نے ۲۰۱۴ء میں دی ایمیریٹس ڈیفنس انڈسٹریز کمپنی قائم کی ہے۔ متحدہ عرب امارات نے روس، سعودی عرب، کویت، الجزائر اور لیبیا سے کسٹمر ایگریمنٹس پر دستخط کیے ہیں۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ متحدہ عرب امارات میں تیار کردہ آرمرڈ ویہیکلز، اسالٹ رائفلز اور پرسنل کیریئرز یمن میں لڑائی کے دوران دکھائی دی ہیں۔

معروف اسکالر جوڈی وٹوری نے ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل کے لیے تیار کردہ ایک رپورٹ ''دی ملٹری انڈسٹریل کمپلیکس اینڈ یو ایس فارن پالیسی ۔۔ دی کیسز آف سعودی عربیہ اینڈ یو اے ای'' میں لکھا ہے: ''مئی ۲۰۱۷ء میں اُس وقت کے سعودی نائب ولی عہد محمد بن سلمان نے سعودی عربین ملٹری انڈسٹریز کمپنی (SAMI) کے قیام کا اعلان کیا جو امریکی ڈیزائن کے مطابق میزائل، ہتھیار اور الیکٹرانکس سسٹم تیار کرے گی۔ یہ کمپنی دراصل محمد بن سلمان کے اِس خواب کا حصہ ہے کہ ۲۰۳۰ء تک سعودی عرب کے تمام دفاعی اخراجات نصف ہو جانے چاہئیں۔

سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات کے معاملے میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ تجارت کے حوالے سے چین کے معاملے میں امریکی سوچ کی یاد دلا رہا ہے۔ چینی مارکیٹ میں بڑا شیئر پانے کے لیے امریکی کمپنیاں جدید ترین ٹیکنالوجی چینی کمپنیوں کے حوالے کرنے کے لیے تیار کر رہی ہیں۔ یہ بات زیادہ حیرت انگیز نہیں کہ آج بہت سی چینی کمپنیاں امریکی اداروں سے حاصل کردہ یا چرائی ہوئی ٹیکنالوجی کی مدد سے نہ صرف اندرونی مارکیٹ کی تشفی کر رہی ہیں بلکہ بیرونی منڈیوں میں بھی اپنا شیئر بڑھا رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر مزید حیرت ہو رہی ہے کہ امریکی حکومت انتہائی سادگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک بڑی غلطی دہرا رہی ہے اور مقصد صرف یہ ہے کہ ہتھیاروں کی فروخت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر کیا جائے۔ یہ بات بھی سب پر واضح ہو جانی چاہیے کہ خالص سیاسی اور اسٹریٹجک نقطۂ نظر سے دیکھیے تب بھی یہ سب کچھ غلط ہے۔ امریکا ہی کہا کرتا تھا کہ مشرقِ وسطیٰ کو سب سے آخر میں جس چیز کی زیادہ ضرورت پڑے گی، وہ ہیں مزید ہتھیار۔ جب مشرقِ وسطیٰ کو اسلحے کی کم ضرورت پڑنی ہے تو وہاں اسلحہ ساز اداروں کو مضبوط بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ مغربی ہتھیار اور ٹیکنالوجی منتقلی سے متعلق معاہدے اور نظام نقائص سے بھرے پڑے ہیں تو اسلحہ سازی کے عمل کو مقامی رنگ دینے کا عمل تخفیفِ اسلحہ سے متعلق تمام دعوؤں اور تصورات کی نفی کرتا ہے۔ متحدہ عرب امارات کے اسلحہ ساز تو بہت خوش ہوں گے کہ اب وہ ''دوستوں'' کو بڑے پیمانے پر اسلحہ فروخت کر سکیں گے۔

ایک طرف تو چین کے حوالے سے امریکا میں یہ پریشان کن تصور پایا جا رہا ہے کہ وہ اسلحہ سازی اور دیگر شعبوں میں امریکی مفادات کے لیے شدید خطرہ بن کر ابھر رہا ہے اور دوسری طرف

اندرونی صفحات پر:۔

- بورس جونسن کی کامیابی، بریگزٹ اور اسکاٹ لینڈ پر اثرات
- چین کی مستقبل بینی
- شہریت کا قانون اور تقسیم ہوتے خاندان
- لیبیا میں بڑھتی کشیدگی اور جنگ بندی کے امکانات
- سنکیانگ مظالم
- بنگلا دیش جماعتِ اسلامی: خواتین، جمہوریت اور سیاست
- دیوندر سنگھ سے اوتار سنگھ تک
- کورونا وائرس کیا ہے؟
- ڈونلڈ ٹرمپ کی 'صدی کی ڈیل' مذاکرات کا نقطۂ آغاز؟

متحدہ عرب امارات کو اسلحہ سازی میں مدد فراہم کرنا؟ شاید یہ تو دنیا میں سے سب سے کم محسوس کی جانے والی ضرورت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس معاملے میں امریکا اپنی روایت برقرار رکھے گا یعنی وقت گزر جانے کے بعد ہی ہوش میں آئے گا۔

اسلحے کا بے مثال تاجر

ایران کے جنرل سلیمانی کی ہلاکت کے بعد سعودی حکام امریکی ایوانِ صدر پہنچے۔ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کو ہتھیار بیچنے کا شوق ہے اور اُن کے پسندیدہ کسٹمر سعودی عرب کے ولی عہد محمد بن سلمان ہیں۔ ۳ جنوری کو امریکی فوج کے ہاتھوں ایران کے جنرل قاسم سلیمانی کی ہلاکت کے فوراً بعد صدر ٹرمپ اسلحہ فروخت کرنے پر تُل گئے۔ اُن کے نزدیک یہ امریکی کانگریس یا نیٹو کے ارکان سے مشاورت سے کہیں بڑھ کر اور بہتر تھا۔

سعودی ولی عہد محمد بن سلمان کے بھائی اور نائب وزیر دفاع خالد بن سلمان کے دورۂ امریکا کا اہتمام کیا گیا۔ انہوں نے ۶ اور ۷ جنوری کو امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ، وزیر دفاع اور وزیر خارجہ سے ملاقات کی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ یہ ملاقاتیں خفیہ رکھی گئیں۔ سعودی حکام نے تو معاملہ طشت از بام کیا تاہم امریکی ایوانِ صدر کی ویب سائٹ پر خالد بن سلمان کی ملاقاتوں کا تا حال کوئی باضابطہ ذکر نہیں۔ امریکی صدر نے ۷ جنوری کو ایک ٹویٹ کے ذریعے بتایا کہ انہوں نے سعودی عرب کے نائب وزیر دفاع سے ملاقات کی ہے۔ اس ملاقات کے دوران چونکہ صدر ٹرمپ کے ذہن پر صرف اور صرف کیش سوار تھا اس لیے انہوں نے اپنے ٹویٹ میں لکھا کہ خالد بن سلمان سے ملاقات میں اسلحے، تیل، تجارت، دفاع، سلامتی اور مشرق وسطیٰ میں استحکام پر بات ہوئی۔

امریکا اور دیگر ترقی یافتہ ممالک سے بڑے پیمانے پر ہتھیاروں کی خریداری کا نتیجہ کیا برآمد ہوگا؟ مشرق وسطیٰ میں بہت جلد صورتِ حال انتہائی خطرناک اور نازک ہوجائے گی۔ کوئی بھی اور خطہ اتنے بڑے پیمانے پر اسلحہ نہیں خرید رہا۔ اور اس خطے کو اسلحہ فراہم کرنے والا سب سے بڑا ملک امریکا ہے۔ سب سے زیادہ اسلحہ سعودی عرب خرید رہا ہے۔

قاسم سلیمانی کے قتل کے بعد مشرق وسطیٰ میں جو کشیدگی پیدا ہوئی ہے اور جس طرح کی صورتِ حال بن رہی ہے، اُسے دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ اسلحے کی دوڑ میں تیزی آئے گی اور اسلحے کے مزید انبار لگیں گے۔ سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات صرف بڑے پیمانے پر اسلحے کی خریداری تک محدود نہیں رہنا چاہتے بلکہ اپنے ہاں اسلحہ ساز ادارے قائم کرنے میں بھی غیر معمولی دلچسپی لے رہے ہیں۔

امریکا اسلحہ فروخت کرنے والا سب سے بڑا ملک ہے، اور امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ اسلحے کے بہت اچھے سیلز مین ہیں۔ انہوں نے ۲۰۱۷ء میں صدر کی حیثیت سے پہلا غیر ملکی دورہ کیا تو سعودی عرب گئے اور وہاں انہوں نے شاہ سلمان کے ساتھ اسلحے کی فروخت کے ایک بڑے معاہدے پر دستخط کیے۔ میڈیا میں اس بات کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا کہ امریکا اور سعودی عرب کے درمیان طے پانے والے اس معاہدے کی مالیت کم و بیش ۱۱۰ ارب ڈالر ہے۔

امریکی کانگریس بہت سے معاملات میں اسلحے کی فروخت پر پابندی عائد کرتی ہے یا چند سخت شرائط عائد کرتی ہے۔ مئی ۲۰۱۹ء میں صدر ٹرمپ نے کانگریس کے تحفظات ایک طرف ہٹاتے ہوئے ہنگامی حالات کا اعلان کیا اور ایران کو بہانہ یا جواز بنا کر کم و بیش ۸ ارب ڈالر کے قطعیت کے ساتھ نشانہ بنانے والے اسلحے و گولا بارود اور دیگر دفاعی سامان کی فروخت کا معاہدہ کیا۔

اب بالکل صاف دکھائی دے رہا ہے کہ صدر ٹرمپ ایران کے حوالے سے پیدا ہونے والی خصوصی صورتِ حال سے متعلق ہنگامی حالت کا اعلان کریں گے اور یوں مشرق وسطیٰ میں اپنے حلیفوں کو بڑے پیمانے پر اسلحے کی فروخت بھی تیز کردی جائے گی۔ ایسے میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ لاک ہیڈ مارٹن، بوئنگ، رتھیون اور دیگر امریکی اسلحہ ساز اداروں کے سیلز مین سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور دیگر ممالک کو زیادہ سے زیادہ اسلحہ فروخت کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔

اسلحے کی فروخت اور بدعنوانی

امریکا بہت بڑے پیمانے پر مشرق وسطیٰ کو اسلحہ فروخت کرتا ہے اور اسلحے کی فروخت کے ہر معاہدے سے کرپشن یا رشوت بھی جڑی ہوئی ہے۔ مشرق وسطیٰ کے ممالک سے کیے جانے والے اسلحے کی فروخت کے معاہدوں میں رشوت یا کرپشن کس حد تک ہے، اسلحہ فروخت کرنے کے معاملے میں سیلز ایجنٹس کتنا کمیشن کھاتے ہیں، کتنی رشوت لیتے ہیں یہ سب کچھ شاید کبھی معلوم نہ ہوسکے۔

اس حقیقت کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ہمیں بہت کچھ اس لیے بھی معلوم نہیں ہو پاتا کہ مشرق وسطیٰ کی حکومتیں چاہتی ہیں کہ اسلحہ اور متعلقہ دفاعی ساز و سامان خریدنے سے متعلق معاہدوں کو مکمل طور پر صیغۂ راز میں رکھا جائے۔ سعودی حکومت چاہتی ہے کہ اسلحے کے تمام معاہدے مکمل رازداری کے ساتھ کیے جائیں۔ امریکی حکومت اگر چاہے تو دفاعی سودوں میں زیادہ شفافیت پر زور دے سکتی ہے مگر وہ ایسا اس لیے نہیں کرتی کہ اُسے صرف اسلحہ بیچنے سے غرض ہے۔

سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات اسلحے کی خریداری کے لیے جو معاہدے کرتے ہیں اُسے صیغۂ راز میں رکھے جانے کے باعث کرپشن یا رشوت ستانی کا پہلو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ مرکزی ڈگر سے ہٹ کر کچھ ایسے انتظامات بھی کیے جاتے ہیں، جن کا مرکزی سودوں اور معاہدوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ سعودی عرب اور امارات کی حکومت کے منتخب کردہ کاروباری شعبوں کے لیے فنڈ فراہم کیے جاتے ہیں۔ جوڈی وٹوری نے ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل کے لیے مرتب کی گئی اپنی رپورٹ میں بتایا ہے کہ سعودی عرب سے کیے جانے والے معاہدوں میں رشوت کا تناسب ایک تہائی اور متحدہ عرب امارات سے کیے جانے والے معاہدوں میں دو تہائی تک ہوسکتا ہے۔ انہوں نے پانچ سال قبل ملڈونلڈ گلس سے کیے جانے والے پانچ ارب ڈالر کے ایک معاہدے کا حوالہ دیا ہے۔ یہ معاہدہ تیل کو غیر معمولی حد تک صاف کرکے شیمپو اور پینٹ میں استعمال کے قابل بنانا تھا۔

جوڈی وٹوری کی رپورٹ میں فرانس کے ایک اسلحہ ساز ادارے سے کیے جانے والے معاہدے کا بھی ذکر کیا گیا ہے، جس کے تحت سعودی حکومت کی نشاندہی پر فرانسیسی ادارے نے تازہ پھولوں کے لیے گرین ہاؤسز قائم کرنے پر فنڈنگ کی۔

امریکی اسلحہ ساز ادارے اس نکتے پر زور دیتے ہیں کہ وہ رشوت ستانی اور بدعنوانی کی دیگر شکلوں سے متعلق امریکی قوانین کے حوالے سے بہت حساس ہیں، یعنی کچھ بھی ایسا ویسا نہیں کرتے مگر حقیقت یہ ہے کہ سعودی عرب سے کیے جانے والے بیشتر آف سیٹ معاہدوں میں امریکیوں کو اصولوں پر سودے بازی کرنا پڑتی ہے اور بہت سے معاملات میں انہیں سعودیوں کی شرائط کے تحت کام کرنا پڑتا ہے۔ سعودی حکام اپنے کسی ایجنٹ کو ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھاتے ہیں یعنی معاملات اُن کے حق میں رہتے ہیں۔

امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ سعودی عرب کو اسلحہ فروخت کرنے کے معاملے میں مشنری جذبے کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ سعودی عرب کو غیر معمولی تعداد و مقدار میں اسلحہ اور گولا بارود فروخت کرنے کی پشت پر کوئی بھی عالمی ہنگامی حالت یا نازک مرحلہ نہیں۔ یہ سب کچھ صرف اس لیے ہو رہا ہے کہ صدر ٹرمپ اس میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے ہیں۔ اکتوبر ۲۰۱۸ء میں سعودی صحافی جمال خاشقجی کے قتل کے حوالے سے ہونے والی ساری تنقید اور انسانی حقوق سے متعلق خدشات کو ایک طرف ہٹا کر امریکی صدر نے سعودی عرب کو بہت بڑے پیمانے پر اسلحہ

باقی صفحہ نمبر ۶

بورس جونسن کی کامیابی، بریگزٹ اور اسکاٹ لینڈ پر اثرات

Thomas Raines - Jason Naselli

برطانیہ کے انتخابات بعد سب سے اہم کام بریگزٹ کا اپنے انجام تک پہنچنا ہے۔ بریگزٹ کے لیے ریفرنڈم سے اب تک یعنی تین ساڑھے تین برس کے دوران غیر یقینی کی صورتحال رہی ہے جہاں ہر نتیجہ ممکن تھا، ہم یہ جانتے ہیں کہ ۳۱ جنوری کے بعد بریگزٹ کے عمل کو پیچھے کی طرف لے جانا ممکن نہیں ہے۔

یہ ایک بڑا کام ہے کیوں کہ بریگزٹ نے برطانیہ اور یورپ دونوں طرف سیاست پر ایک گہرا نفسیاتی اثر ڈالا ہے۔ یورپ ایک غیر یقینی شراکت دار کے ساتھ کام کر رہا ہے، جس کی کوئی سمت متعین نہیں ہے۔ کچھ کو ابھی تک امید تھی کہ شاید بریگزٹ کی واپسی کی کوئی راہ نکل آئے لیکن اب سب کچھ بالکل واضح ہے۔

یہ ایک لازمی امر ہے کہ کاروبار کے کسی بھی حکم نامے سے پہلے واپسی کا معاہدہ منظور کیا جائے گا، جو اکثریت قدامت پسندوں نے حاصل کی ہے اس لحاظ سے بریگزٹ کا عمل مکمل ہو چکا ہے، اب محض ایک رسمی کارروائی رہ گئی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگلے سال کے اہداف کیا ہیں؟ دسمبر ۲۰۲۰ء اور منتقلی کے دورانیے کے اختتام سے پہلے ہی مذاکرات کے نئے طریقے اور نئے عزم کے ساتھ نئے انداز میں تعلقات استوار کیے جائیں گے، دیکھنا یہ ہے کہ اگلے برس طے کردہ اہداف کا حصول کس حد تک ممکن ہے؟

یہاں تین ممکنہ نتائج ہو سکتے ہیں پہلا یہ کہ متعین مدت کو نظر انداز کیا جائے، بورس جانسن اپنے وعدے پر عمل کرتے ہوئے منتقلی کے دورانیے کو گزرنے دیں اور نتیجے کے طور پر کوئی تجارتی معاہدہ طے نہ کیا جائے۔ دوسرا اصل یہ ہے کہ مذاکرات کے ذریعے ۲۰۲۰ء کے اختتام تک کچھ نتیجہ خیز کام کرنے کی کوشش کی جائے۔ شاید یہ مذاکرات بغیر گرم جوشی اور خیر سگالی کی وجہ سے پائیدار نہ ہوں یا شاید معاہدے کے ساتھ ساتھ سمجھوتے کی شرائط بھی ہوں، جس میں توسیع شامل نہیں ہوگی۔ لیکن ایک عارضی معاہدہ طے پانے کے امکانات ہیں جس پر عمل درآمد کی مدت بھی طے کی جائے گی۔

ایک صورتحال یہ بھی بن سکتی ہے کہ اہم موضوعات کا حل تلاش کرنے کے لیے مذاکرات کی مدت میں توسیع کے ساتھ منتقلی کے دورانیے کے اختتام تک ایک بنیادی معاہدہ طے کیا جائے، یورپ معاہدے کے ایک فریق کی حیثیت سے ممکنہ طور پر زراعت کے شعبے تک رسائی پانے کے لیے اصرار کرے اور ماہی گیری کے حقوق بھی مانگے۔

ایک تیسرا اصل یہ بھی نکل سکتا ہے کہ بورس منتقلی میں توسیع کرتے ہوئے اپنے وعدہ سے انحراف کریں، ان کی ساری توجہ یورپ سے بغیر کسی معاہدے کے جلد از جلد علیحدگی پر مرکوز ہے۔ انہوں نے ایک سیاسی فیصلہ کیا ہے، مذاکرات کے لیے سیاسی فیصلہ اہم سمجھوتوں سے بہتر ہے یہی مذاکرات بغیر کسی معاہدے کے معاملات کو حل کریں گے ممکن ہے کہ بورس پہلے جیسا ہی کوئی سیاسی فیصلہ کریں۔

کوئی بھی حل مثالی نہیں ہے پہلے میں شدید معاشی بگاڑ پیدا ہوگا، دوسرا اصل یورپ کی حیثیت مستحکم کرے گا، جبکہ تیسرا حل وعدے کی خلاف ورزی ہے۔ منتقلی کی آخری تاریخ اس وقت کتنی اہم ہے؟ یہی موضوع بریگزٹ کے طرفداروں اور یورپین ریسرچ گروپ کے قدامت پسند ارکان کے لیے اہم تھا، لیکن بورس کو ملی اکثریت کی وجہ سے انہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کیوں کہ ووٹروں کے لیے یہ موضوع اہم نہیں تھا، بورس نے ان سے پہلے ہی کہہ رکھا ہے کہ جنوری کے اختتام تک برطانیہ یورپ سے علیحدہ ہو جائے گا۔

خیال یہ ہے کہ جانسن کی سیاست کے لیے کچھ وقت دیا جائے گا، اس دوران اس کو حاصل کردہ اکثریت کے زور پر بریگزٹ کا پہلا مرحلہ مکمل ہو چکا ہوگا، اس کے ساتھ علیحدگی سے متعلق تمام بحث بھی ہو چکی ہوگی۔

تمام موضوعات سے متعلق مذاکرات تکنیکی نوعیت کے ساتھ ساتھ دشوار بھی ہوں گے، ان کی نوعیت تلخ بھی ہوگی لیکن ایسے مذاکرات اخبار کی شہ سرخی نہیں بنیں گے یہ مذاکرات کا پہلا دور ہوگا اور کمزور پالیمان کے ہوتے ہوئے یہ کوئی تماشا نہیں کر سکیں گے۔

امید کی جا سکتی ہے کہ معاہدے کے تمام پہلوؤں پر غور ہوگا، بحث کا موضوع اور اس کے نتائج یورپ کے ساتھ علیحدگی بمقابلہ وابستگی سے بڑھ کر مستقبل کے تعلقات پر مشتمل ہوگا اور یہی بنیادی سوال بھی ہے۔

برطانیہ کے وزیر اعظم مذاکرات کے لیے کوئی طے شدہ تاریخ نہیں دیں گے بلکہ غیر متوقع یا فوری طور پر دی گئی تاریخوں پر مذاکرات کریں گے لیکن اس دوران سیاسی وعدوں کو بھی ان میں شامل کیا جائے گا، حقیقت میں یہ سب کچھ برطانیہ کی پوزیشن کو کمزور کرے گا۔ برطانیہ کے حق میں اس وقت سخت موقف دکھانے سے بہتر لچک دکھانا ہوگا۔

یہاں ایک بڑا موضوع ابھی تک زیر بحث نہیں آیا، ایس این پی نے اسکاٹ لینڈ میں ۵۹ میں ۴۸ سیٹیں جیتی ہیں، ان مذاکرات میں کیا اسکاٹ لینڈ کا مستقبل بھی زیر بحث آئے گا۔

ایس این پی نے غیر متوقع طور پر اپنی پوزیشن مستحکم کی ہے، یہ صورتحال مستقبل میں برطانیہ کے لیے ایک آئینی جدوجہد کا راستہ کھول دے گی۔

یہاں پر سب سے بڑا مسئلہ آزاد اسکوٹش کے حامیوں کو درپیش ہے ایک طرف بریگزٹ نے سیاسی طور پر اسکوٹش آزادی کو مضبوط کیا ہے اور یہی موضوع اسکوٹش اور باقی برطانیہ کی سیاسی ترجیحات کی مکمل عکاسی بھی کرتا ہے۔

برطانیہ کے یورپ سے علیحدگی کے بعد اسکوٹش آزادی تکنیکی اور معاشی لحاظ سے مزید مشکلات میں گھر جائے گی، ماضی میں جو مشکلات شمالی آئی لینڈ اور ریپبلک آئی لینڈ کے درمیان پیش آئیں ویسی ہی مشکلات یہاں متوقع ہیں۔ برطانیہ اور اسکاٹ لینڈ کے درمیان کرنسی کا مسئلہ بھی درپیش ہے اس کے علاوہ مختلف چیلنج جیسے تجارت اور سرحدوں کا انتظام وغیرہ جیسے مسائل بھی بحث طلب ہیں، یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر برطانیہ کے لیے بریگزٹ مشکل ہوا تو وہ بڑی انتظامی صف بندی کے بغیر ہی یورپی یونین سے نکل جائے گا۔

آزادی کے لیے دوسرے ریفرنڈم کا مطالبہ بورس جونسن مسترد کر دیں گے، مختصر دورانیے میں یہ ممکن نہیں ہے۔ تھریسا مے نے ۲۰۱۷ میں اس بارے میں بار بار یہی کہا تھا کہ یہ مسئلے کو حل کرنے کا وقت نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح بورس جونسن بھی دباؤ سے باہر آنے کی کوشش کریں گے، وہ یورپی یونین سے باہر آنے کے بعد ہی اس مسئلے کی طرف توجہ دیں گے۔ یورپ سے علیحدگی کے بعد اگلا مرحلہ ۲۰۲۱ میں اسکوٹش پارلیمان کے انتخابات کا ہوگا۔ اگر اسکاٹ لینڈ کے لوگ اسکاٹش نیشنل پارٹی کو ووٹ دیتے رہے تو یہ جمہوری طور پر غیر مستحکم صورتحال ہوگی اور دوسرا متوقع ریفرنڈم کروانے سے ان کے آزادی کے جذبات کو تقویت ملے گی۔ (مترجم: سمیہ اختر)

"What Boris Johnson's big win means for Brexit and Scotland".
("chathamhouse.org". December 13 2019)

چین کی مستقبل بینی

امریکا اور چین کے درمیان فائیو جی ٹیکنالوجی اور دنیا کے وائیرلیس انفرااسٹرکچر پر کنٹرول کی لڑائی جاری ہے۔ تاہم دنیا کی معیشت اور تحفظ سے متعلق ایک اہم معاملے پر بہت کم توجہ دی جارہی ہے۔ یہ معاملہ ہے ڈیجیٹل معیشت کے لیے ضروری معدنیات پر چین کے کنٹرول کا۔

یہ رپورٹ امریکی جریدے Foreign Policy کے تحقیقی شعبے FP Analytics نے مئی ۲۰۱۹ء میں جاری کی ہے۔

کوئی بھی نیا فون، ٹیبلیٹ، گاڑی یا سیٹلائیٹ کچھ مخصوص معدنیات کے بغیر نہیں بن سکتے۔ یہ معدنیات دنیا کے کچھ ہی ممالک میں پائے جاتے ہیں اور ان کے گِنے چُنے متبادل ہی دستیاب ہیں۔ چینی کمپنیوں نے غیر شفاف اور اکثر سیاسی طور پر غیر مستحکم ممالک کی منڈیوں میں ان معدنیات اور دھاتوں کی فراہمی پر کنٹرول حاصل کرلیا ہے۔ اس کام کے لیے انھوں نے بڑے پیمانے پر کی گئی چینی سرمایہ کاری کا بھی استعمال کیا ہے۔ ان کمپنیوں کی رپورٹوں کے گہرائی سے مطالعے اور دیگر ذرائع سے تحقیق کے بعد FP Analytics نے معدنیات کی عالمی مارکیٹ پر اس غیر معمولی قبضے کے حوالے سے پہلی جامع رپورٹ تیار کی ہے۔ حقائق پر مبنی اس رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ چین کس تیزی اور موثر طریقے سے اپنے قومی عزائم کو پورا کررہا ہے اور اس کے باقی دنیا پر کس قسم کے اثرات مرتب ہورہے ہیں۔

چین نے اپنے تیرہویں پانچ سالہ منصوبے (۲۰۲۰-۲۰۱۶ء) کو Nonferrous دھاتوں کی صنعت کے حوالے سے فیصلہ کن جنگ کا دور کہا ہے۔ اس منصوبے کا ایک اہم حصہ "Made In China 2025" پروگرام بھی ہے۔ اس کا مقصد قومی دفاع، سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبے میں صنعت کاری کو بڑھانا ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے اکتوبر ۲۰۱۶ء میں چین کی وزارت صنعت نے چین کو دھاتوں کی صنعت میں عالمی طاقت بنانے کے لیے لائحہ عمل کا اعلان کیا۔ اس کام کے لیے چین معدنیات سے زرخیز خطوں میں سرکاری اور نجی کمپنیوں کو بھیج رہا ہے تاکہ ان ممالک کے معدنی وسائل پر گرفت مضبوط کی جاسکے۔ ان معدنی وسائل میں وہ معدنیات بھی شامل ہیں، جن میں چین پہلے ہی ایک مستحکم پوزیشن رکھتا ہے۔

چین نے اس کام کے لیے نہایت مناسب وقت کا انتخاب کیا۔ ۲۰۱۱ء سے ۲۰۱۵ء کے دوران دھاتی اشیا کی قیمتوں میں آنے والی کمی سے کان کنی کی بہت سی کمپنیاں سرمائے کے متعلق پریشان تھیں۔ یہاں تک کہ Angola American جیسی بڑی کمپنی کو بھی افرادی قوت اور اثاثوں میں کمی کرنا پڑی۔ چینی کمپنیوں نے کانوں کی براہ راست خریداری، دیگر کمپنیوں میں حصص کے حصول، کانوں کی موجودہ اور مستقبل کی پیداوار کو خریدنے کے معاہدوں اور نئے پروجیکٹ میں سرمایہ کاری کی شکل میں کان کنی کی کمپنیوں کو ان کی ضرورت کا سرمایہ مہیا کیا اور خود معدنیات کی عالمی پیداوار پر کنٹرول حاصل کرلیا۔

اگرچہ چین میں کافی معدنیات پائے جاتے ہیں تاہم چین کو کوبالٹ، پلاٹینیم گروپ کی دھاتوں اور لیتھیم جیسی معدنیات کے فقدان کا سامنا ہے۔ یہ ٹیکنالوجی کے حوالے سے چین کے عزائم کے لیے اہم ہیں۔ چین نے ان معدنیات پر کنٹرول کے لیے دو طرح کی حکمت عملیاں اختیار کی ہیں۔ ایک حکمت عملی یہ ہے کہ حکومتی ملکیت والی کمپنیوں یعنی State Owned Enterprises (SEOs) کو متحرک کیا جائے، جو حکومتی امداد اور سرمایہ کاری کا استعمال کرتے ہوئے خود کو دیگر ممالک میں مضبوط کریں اور حکومتی افراد کے ساتھ مراسم پیدا کریں۔ دوسری حکمت عملی ان ہی مقاصد کے حصول کے لیے نجی کمپنیوں کے استعمال کی ہے۔

اپنی اس حکمت عملی کی وجہ سے چین معدنیات کے اس کھیل میں دنیا سے دس سال آگے ہے۔ رواں سال جون میں کانگو میں ہونے والی ایک کانفرنس میں ۵۳ چینی کمپنیوں نے Union of Mining Companies کے قیام کا اعلان کیا۔ یہ دراصل چینی صنعت کاروں اور کانگو کی حکومت کے درمیان اس گہرے اور دیرپا تعلق کا اعلان تھا جو گزشتہ سالوں میں قائم ہوا۔

چین اس وقت کانگو سے نکلنے والے کوبالٹ کے نصف حصے پر اپنا کنٹرول رکھے ہوئے ہے۔ صدارتی انتخابات سے چھ مہینے قبل ہونے والی اس کانفرنس نے صدارتی امیدواروں کو واضح پیغام دیا کہ کوبالٹ کی صنعت پر چین کس قدر کنٹرول رکھتا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ کانگو کی ۸۰ فیصد معیشت کا انحصار کوبالٹ پر ہے۔

دنیا میں کوبالٹ کی کل پیداوار اور معلوم ذخائر کا دو تہائی حصہ کانگو میں ہے جس کی وجہ سے یہ بیٹری کی صنعت سے منسلک سرمایہ کاروں کے لیے ایک اہم ملک ہے۔ اسی وجہ سے چین نے گزشتہ ایک دہائی میں سیاسی تعلقات کے فروغ اور پیداواری انفرااسٹرکچر میں سرمایہ کاری کے ذریعے یہاں اپنی پوزیشن مضبوط کی ہوئی ہے۔ ۲۰۰۷ء میں چین کے Export-Import Bank نے انفرااسٹرکچر کی مد میں ۶ ارب ڈالر (جو بعد میں ۳ ارب ڈالر کردیے گئے) اور تانبے اور کوبالٹ کی کان کنی کے لیے ۳ ارب ڈالر فراہم کیے۔ یہ پراجیکٹ Sinohydro اور China Railway Group کے تحت چلائے جارہے ہیں۔ ان کمپنیوں کے پاس تانبے اور کوبالٹ کی کان Sicomine کے ۶۸ فیصد حصص ہیں۔ یہ کان افریقا کی سب سے بڑی کانوں میں سے ایک کان ہے۔ چین نے کانگو کی سرکاری کمپنی Gécamines کی بحالی، صنعتی سیکٹر کے استحکام اور ملازمت کے مواقع پیدا کرنے کے وعدے سے کانگو کا خود پر انحصار بڑھالیا ہے۔

کانگو کی قرضوں میں ڈوبی ہوئی کمپنیوں کو ہدف بنا کر چین کی سرکاری کمپنیوں نے کانوں میں حصص حاصل کیے اور اپنا اثر و رسوخ بڑھایا۔ ان کانوں میں Tenke Fungurume نامی کان بھی شامل ہے جہاں اعلیٰ قسم کے تانبے اور کوبالٹ کے دنیا کے بڑے ذخائر میں سے ایک موجود ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چین نے کانگو کی ۱۰ بڑی کانوں اور ۶ ترقیاتی منصوبوں کی ملکیت حاصل کرلی ہے۔ چین نے کانگو اور دنیا کی کوبالٹ پیدا کرنے والی سب سے بڑی کان میں بھی حصص حاصل کرلیے ہیں۔ اس کی وجہ سے کانگو میں کوبالٹ کی کل پیداوار کے ۵۲ فیصد پر چین نے اپنا اثر و رسوخ قائم کرلیا ہے۔

دنیا میں کوبالٹ کی بڑھتی ہوئی مانگ کے سبب کانگو کے سابق صدر جوزف کابیلہ نے کان کنی کے قانون میں تبدیلی کی اور منافع پر ۵۰ فیصد ٹیکس عائد کردیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے کوبالٹ پر Tax Royalty کو بھی تین گنا کردیا ہے تاکہ اس سے حکومتی منافع میں اضافہ ہو۔ ہمسایہ ملک زیمبیا میں بھی اسی قسم کے ٹیکس کے بارے میں سوچا جارہا ہے۔

سرکاری ملکیت کی کمپنیوں کو استعمال کرنے کی چین کی حکمت عملی افریقا میں خاص کامیاب رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کان کنی کی صنعت میں جاری معاشی بدحالی میں ان کمپنیوں کو لوگوں نے امید کی ایک کرن کے طور پر دیکھا۔ ان کمپنیوں نے China-Africa Development Fund کے اشتراک سے خود کو جنوبی افریقا کے Bushveld Complex تک پھیلا لیا ہے۔ اس خطے میں دنیا کا اعلیٰ ترین وینڈیم اور

پلاٹینیم پایا جاتا ہے۔ پلاٹینیم گاڑیوں کے کیٹیلیٹک کنورٹر میں استعمال ہوتا ہے جو گاڑیوں سے نکلنے والے خطرناک دھوئیں کو صاف کرتا ہے۔ وینڈیم ہائی ٹیک صنعتوں، دفاعی صنعت، خلابازی کی صنعت اور قابل تجدید توانائی کے شعبوں کے لیے ایک انتہائی اہم اور لازمی دھات ہے۔ اس خطے میں چین کی سرمایہ کاری اور طویل مدتی معاہدوں کی وجہ سے جنوبی افریقا کی کل برآمدات میں معدنیات کا حصہ سب سے زیادہ ہوگیا ہے اور معدنیات کی کل برآمدات کا ۵۰ فیصد حصہ چین جاتا ہے۔ اس وجہ سے جنوبی افریقا کی معاشی بحالی بھی اب براہ راست چینی سرمایہ کاری سے جڑی ہوئی ہے۔

چین جمہوری اور Market-Oriented ملکوں میں نجی ملکیت کی چینی کمپنیوں کا استعمال کر رہا ہے جنہیں حکومتی سرمایہ مہیا کیا جاتا ہے۔ یہ کمپنیاں مقامی کمپنیوں میں حصص حاصل کرتی ہیں اور چھوٹے کاروباری لوگوں کی سرپرستی کرتی ہیں۔ نجی ملکیت کی کمپنیوں کو استعمال کرنے کی حکمت عملی آسٹریلیا، ارجنٹینا اور چلی میں واضح طور پر کامیاب ہوتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ان تین ممالک میں دنیا کا ۹۰ فیصد لیتھیم پیدا ہوتا ہے۔ اور ان ہی تین ممالک میں دنیا میں لیتھیم کے معلوم ذخائر کا تین چوتھائی حصہ بھی موجود ہے۔ صرف چھ سالوں میں چین نے لیتھیم کی مارکیٹ پر غلبہ حاصل کرلیا ہے اور اب وہ لیتھیم کے ۵۹ فیصد ذخائر پر اپنی گرفت رکھتا ہے۔

چین کے سرکاری بینکوں کے سرمائے سے چین کی دو بڑی کمپنیاں Tianqi Lithium اور Ganfeng Lithium دنیا میں لیتھیم پیدا کرنے والی تیسری بڑی کمپنیاں بن گئی ہیں۔ ان دونوں کمپنیوں نے دیگر چینی اداروں کے ساتھ مل کر اپنی سرمایہ کاری اور کام کو پھیلانے کے لیے چلی کی کمپنیوں میں حصص حاصل کیے، ارجنٹینا میں ترقیاتی منصوبوں میں سرمایہ کاری کی اور آسٹریلیا میں کانوں کی خریداری اور پروسیسنگ پلانٹ میں سرمایہ کاری کی۔

۲۰۱۸ء کی ابتدا میں Tianqi Lithium نے چلی کی ایک کمپنی SQM کے ۲۴ فیصد حصص حاصل کیے۔ یہ کمپنی دنیا میں لیتھیم پیدا کرنے والی دوسری بڑی کمپنی ہے۔ دنیا میں پائے جانے والے لیتھیم کے ذخائر کا ۵۷ فیصد حصہ چلی میں پایا جاتا ہے ان میں سے آدھے ذخائر کا کنٹرول SQM کے پاس ہے۔ SQM کے حصص حاصل کرنے کی ڈیل معدنیات کی صنعت میں اب تک کی سب سے بڑی ڈیل ہے، جو کہ ۴.۱ ارب ڈالر میں انجام پائی۔

چلی کی حکومت نے ہمیشہ ملک کے لیتھیم کے ذخائر پر سخت کنٹرول رکھا ہے کیوں کہ یہ ملک کے جوہری پروگرام کے لیے اہم ہے لیکن چینی کمپنی کو حصص کی فروخت نے اس معاملے میں شکوک پیدا کردیے ہیں۔ اگرچہ اصل ڈیل میں Tianqi کے بورڈ کو SQM کے حساس ڈیٹا تک رسائی سے روکا گیا ہے، تاہم اب بھی یہ چینی کمپنی SQM پر خاطر خواہ اثر رسوخ رکھتی ہے۔

ارجنٹینا کے صدر نے ملک میں معدنیات کی برآمدات پر عائد ٹیکسوں میں کمی کا فیصلہ کیا ہے۔ یہاں چین معدنیات کے شعبے میں سرمایہ کاری کر رہا ہے اور بدلے میں مستقبل میں نکلنے والے لیتھیم کے حصول کے معاہدے کر رہا ہے۔ چینی کمپنیوں کے پاس ارجنٹینا میں جاری معدنی منصوبوں کے ۴۱ فیصد حصص ہیں۔ ان منصوبوں میں ارجنٹینا کے کل ذخائر کا ۳۷ فیصد شامل ہے۔ اس پالیسی کے ثمرات بھی سامنے آنا شروع ہوگئے ہیں۔ ارجنٹینا سے چین کو ہونے والی لیتھیم کی برآمدات میں ۲۰۱۵ء سے ۲۰۱۷ء کے دوران چار گنا اضافہ ہوا ہے۔ یہی پالیسی آسٹریلیا میں بھی کامیاب رہی۔ مذکورہ دونوں چینی کمپنیوں نے آسٹریلیا میں جاری لیتھیم کی کان کنی کے منصوبوں میں ۹۱ فیصد حصص اور لیتھیم کے ذخائر کے ۷۵ فیصد پر کنٹرول حاصل کیا ہوا ہے۔

عالمی منڈی کے وہ وسائل جن پر چین کی اجارہ داری ہے، اب چین ان پر بھی اپنے کنٹرول کو مزید سخت کرنے کے لیے اقدامات کر رہا ہے۔ چین ایسے قدرتی وسائل میں نہ صرف خودکفیل ہے بلکہ اس کے پاس یہ معدنیات وافر مقدار میں ہیں جیسا کہ دنیا بھر کی وہ ۱۰ معدنیات اور دھاتیں جو مقدار میں سب سے کم ہیں اور ہائی ٹیک صنعت کے لیے کلیدی حیثیت رکھتی ہیں وہ بھی وافر مقدار میں ہیں اور یہی وہ دھاتیں ہیں جن پر چین کے کمرشل اور تزویراتی حریف انحصار کرتے ہیں۔ اپنے کنٹرول کو مزید مستحکم کرنے کے لیے چینی کمپنیاں نہ صرف ان دھاتوں کی کانوں کی خریداری کر رہی ہیں بلکہ ان کی پیداوار کی خریداری بھی بڑے پیمانے پر کر رہی ہیں جس سے چین کو ہائی ٹیک صنعت میں سبقت حاصل ہو جائے گی بلکہ اس کی جیو پولیٹیکل طاقت میں بھی اضافہ ہوگا۔

شاید معدنی وسائل پر اپنے غلبے کو برقرار رکھنے اور نادر و اہم کیمیائی عناصر کو دریافت کرنے کی خواہش کے اعتبار سے چین کی مثال نہایت موزوں ہے۔ ۱۷ ایسے مشہور کیمیائی عناصر جسے با آسانی تجارتی بنیادوں پر دستیاب کیا جاسکتا ہے لیکن چین دانستہ ایسا نہیں کر رہا۔ یہ سارے عناصر دفاعی ساز و سامان، خلابازی، برقیات اور قابل تجدید توانائی کی صنعتوں کے لیے اہم ہیں۔ گزشتہ دو دہائیوں میں چین نے ان اہم کیمیائی عناصر کی کل پیداوار کا ۸۰ فیصد نکالا اور ان معدنیات کو صاف کیا ہے۔ ۲۰۱۰ء میں چین نے جاپان کو ان کیمیائی اشیا کی فراہمی میں تخفیف کردی تھی، جس کی وجہ چین کے مشرقی سمندر میں کشیدگی کی فضا کا پیدا ہونا تھا۔ اس کے اگلے ہی سال چین نے ایکسپورٹ کوٹا نافذ کردیا جس سے صنعتی اداروں اور حکومتوں میں افراتفری پیدا ہوگئی۔ لیکن جاپان کے سوا دیگر ممالک نے اس بار وقتی اقدامات تو کیے لیکن مستقبل کے حوالے سے کوئی خاص منصوبہ بندی نہیں کی۔

۱۹۹۰ء میں چین نے Rare Earth Elements کو تزویراتی وسائل قرار دے کر اس شعبے میں غیر ملکی سرمایہ کاری پر پابندی لگا دی۔ ۶ سرکاری کمپنیاں اس ساری صنعت پر مکمل کنٹرول رکھتی ہیں۔ ۲۰۱۸ء میں حکومت نے اس کی پیداوار میں ۳۶ فیصد کمی کردی۔ جب کہ دوسری طرف ان معدنیات کی مانگ میں ۲۰۲۵ء تک ۱۷ فیصد اضافہ ہوگا۔ اسی طرح چین دیگر ملکی معدنیات پر بھی مکمل کنٹرول کیے ہوئے ہے۔ چینی کمپنیاں تیزی سے دیگر ممالک میں بھی ان معدنیات کی کانیں خرید رہی ہیں۔ اسی طرح روس بھی اس شعبے میں غیر ملکی سرمایہ کاری کو محدود کرتا جا رہا ہے۔ اس کے برعکس امریکا کی Rare Earth Elements کی درآمدات میں مستقل اضافہ ہو رہا ہے۔ صرف ۲۰۱۸ء میں امریکا نے ۱۶۰ ملین ڈالر کی درآمدات کی ہیں۔ اگرچہ صدر ٹرمپ نے اس معاملے پر کچھ احکامات جاری کیے لیکن اس پر مزید کام نہیں ہوسکا ہے۔ اس کے برعکس چینی کمپنیاں تیزی سے دنیا بھر کی کمپنیوں سے شراکت داریاں کر رہی ہیں اور چین نے بحیثیت ریاست اس پر بھرپور توجہ دے رکھی ہے۔ جس سے چین کی جیو پولیٹیکل طاقت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

وسائل کی ان اقسام پر کنٹرول قائم کرنے سے چین کو اس بات کا اندازہ ہوجائے گا کہ آیا وہ semiconductor کی صنعت پر سبقت لے جانے سے وہ اس صنعت میں بھی مرکزی حیثیت حاصل کرلے گا۔ ہائی ٹیک انڈسٹری کے لازمی جزو کے طور پر استعمال ہونے والی معدنیات پر چین کا کنٹرول تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔ اس انڈسٹری میں مزید ترقی کے لیے جن معدنیات کی ضرورت ہے ان سات میں سے چھ پر چین کا ۷۵ فیصد کنٹرول ہے۔

تاہم چین کے پاس اس صنعت کی صف اول کی کمپنیوں جیسے semiconductor تیار کرنے کی صلاحیت کا اب بھی فقدان ہے۔ اور چین اب بھی تقریباً ۲۶۰ ارب ڈالر ان کی درآمدات پر خرچ کر رہا ہے۔ حکومت اپنے حریفوں کو پیچھے چھوڑنے کے لیے اس شعبے پر اپنی توجہ مرکوز کیے ہوئے ہے۔

چین نے اس شعبے میں ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ پر ۲۰۱۴ء سے ۲۰۱۷ء تک ۲۰ ارب ڈالر کی خطیر رقم خرچ کی ہے۔

اگر چین اس صنعت میں بھی مکمل مہارت حاصل کر لیتا ہے اور منڈیوں میں اس صنعت سے متعلق اشیا کی بھرمار کرتا ہے (جیسا کہ اس نے سولر پینل اور ونڈ ٹربائین کے معاملے میں کیا تھا) تو نہ صرف ان اشیا کی دیگر صنعتیں تباہ ہو جائیں گی بلکہ ہماری قومی سلامتی، دفاعی نظام، ہماری معیشت کا انحصار بھی چینی صنعتوں پر بڑھ جائے گا۔ جیسا کہ سرکاری حکام اب semiconductor کی فروخت پر نگرانی شروع کر چکے اور اس کی فروخت کو محدود کرتے جا رہے ہیں، اسی طرح امریکی حکومت نے مختلف چینی کمپنیوں کو semiconductor کی فروخت پر عارضی پابندی لگائی ہے ان اقدامات سے چین کی مقامی صنعت کو خود مختار بنانے کا نہ صرف جذبہ بڑھے گا بلکہ وہ اس پر تیزی سے کام بھی کرے گا۔ اصل توجہ اس بات پر دینی چاہیے کہ چین ان معدنی وسائل کے خام مال پر مکمل کنٹرول حاصل نہ کر پائے اور نہ ہی power computing خود مختاری حاصل کرے۔

لیکن یہ کوئی حتمی مشاہدہ نہیں ہے۔ تاہم اس بات پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم تزویراتی صنعتوں اور طویل مدتی سرمایہ کاری کو کتنی اہمیت دیتے ہیں، اس کے علاوہ معاشی خوشحالی اور قومی سلامتی کے شعبے کو اس ڈیجیٹل دور میں کس تناظر میں دیکھتے ہیں۔ کچھ ممالک تو اس حوالے سے نہ صرف سوچ رہے ہیں بلکہ بھرپور اقدامات بھی کر رہے ہیں۔ ماہ اپریل میں امریکی حکام نے lithium کی صنعت سے تعلق رکھنے والے ماہرین اور اسٹیک ہولڈرز سے ایک میٹنگ کی جس میں انھوں نے بجلی سے چلنے والی گاڑیوں کے لیے ملکی طور مکمل سپلائی چین (Supply Chain) بنانے پر حکمت عملی تشکیل دینے کی بات کی۔۔۔ اور یہ ایک آغاز ہے۔

بقیہ: امریکی ٹیکنالوجی کی مشرقِ وسطیٰ منتقلی

فروخت کرنے کی اجازت دی۔ جنرل قاسم سلیمانی کی ہلاکت سے سعودی یقیناً خوش ہوئے ہوں گے کہ امریکی عوام کی توجہ اب اُن پر نہیں، ایران پر ہے۔ اسلحہ بیچنے کے معاملے میں صدر ٹرمپ اس قدر پرجوش، بلکہ جذباتی ہیں کہ اُنہیں اس بات سے بھی خوف نہیں آتا کہ اس عمل میں وہ انتہائی حساس ہتھیار اور دیگر ساز و سامان سعودیوں کے ہاتھ میں دے سکتے ہیں۔

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"US Tech Transfer: First to China, Now to the Middle East". ("theglobalist.com". January 20 to 22, 2020)

شہریت کا قانون اور تقسیم ہوتے خاندان

بھارت میں ''شہریت ترمیمی'' بل کے خلاف احتجاج میں نوجوان اور خاص طور پر لڑکیاں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہیں۔ ان احتجاجی مظاہروں میں اب تک پولیس تشدد سے متعدد افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ بیس سالہ طالبہ پری یا بھی اِن مظاہروں میں حصہ لیتی ہیں لیکن انھیں پولیس تشدد سے زیادہ اس بات کا ڈر ہوتا ہے کہ کہیں ان کے والد کو ان کی سرگرمیوں کا علم نہ ہو جائے اور وہ ان کی تعلیم بند نہ کروا دیں۔ پری یا اپنے والد کے بارے میں بتاتی ہیں کہ ''وہ مسلمانوں سے اتنی نفرت کرتے ہیں کہ اپنی ہر ناکامی کا ذمہ دار مسلمانوں کو سمجھتے ہیں۔ میں نے کئی بار ان سے اس بارے میں بات کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ہر بار وہ مجھے کالج سے نکالنے اور میری شادی کر دینے کی دھمکی دے کر بات ختم کر دیتے ہیں''۔ پری یا کے والد انھیں واٹس ایپ پر فیک ویڈیو اور تصاویر بھیجتے رہتے ہیں لیکن جب وہ انھیں ان ویڈیو اور تصاویر کی تصدیق کے لیے ویب سائٹس کے لنک بھیجتی ہیں تو انھیں اُن ہی دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس وجہ سے انھوں نے اپنے سیاسی نظریات کو اپنے والدین سے چھپایا ہوا ہے۔ پری یا اپنے سیاسی نظریات کا اظہار ٹویٹر پر کرتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کے والدین کو ان کے ٹویٹر اکاؤنٹ کا علم نہیں ہے۔

پری یا اس صورت حال سے اکیلی دوچار نہیں ہیں۔ ان کی کہانی بھارت بھر میں کھانے کی میزوں، تقریبات اور سوشل میڈیا پر ہونے والے مباحث کی عکاس ہے۔ شہریت ترمیمی بل کے خلاف احتجاج کرنے والی طالبات کو ان کے والدین کی جانب سے واٹس ایپ اور دیگر سوشل میڈیا پر ایسے پیغامات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جو غلط معلومات پر مبنی ہوتے ہیں۔

انشُل تیواری ایک خبری ویب سائٹ کے مدیر ہیں، ان کا کہنا ہے کہ سوشل میڈیا پر ہونے والی اس جنگ سے ذاتی تعلقات اور رشتوں میں دراڑیں پڑ رہی ہیں۔ دنیا بھر میں موسمی تبدیلیوں کے حوالے سے ہونے والے احتجاجی مظاہروں اور ہانگ کانگ میں جاری احتجاج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ نوجوان چاہتے ہیں کہ ان کی آواز سنی جائے۔ دنیا بھر کے نوجوانوں کے برعکس بھارتی نوجوانوں کو ایک ایسے ثقافتی پس منظر میں جہاں والدین کے اختیارات پر زور دیا جاتا ہے، اظہار رائے کے ذرائع تلاش کرنا ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات بھارتی والدین خود کو اس بات کا اہل سمجھتے ہیں کہ وہی یہ فیصلہ کریں کہ ان کے بچے کیسے زندگی گزاریں، کس سے محبت کریں حتیٰ کہ وہ کس بارے میں سوچیں۔

سویتا بگاریا بھی بمبئی میں مقیم ایک ویڈیو ایڈیٹر ہیں۔ پری یا کی طرح وہ بھی شہریت بل کے خلاف ہونے والے احتجاجی مظاہروں میں حصہ لیتی ہیں۔ ان کے نزدیک یہ قانون انسانی حقوق کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ ان خیالات نے ان کے خاندان اور ان کے درمیان خلیج کو مزید وسیع کر دیا ہے۔ ان کے مطابق اُن کے خاندان کے افراد سخت مُتعصّب ہیں، جو نہ ہی مسلمانوں کے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں اور نہ انھیں کام پر رکھنا چاہتے ہیں۔

سویتا کہتی ہیں کہ ٹویٹر پر اپنے جیسے دیگر افراد سے ملنے سے پہلے وہ یہ سمجھتی تھیں کہ اس صورت حال سے وہ اکیلی ہی دوچار ہیں۔ وہ اِن افراد کو اپنا متبادل خاندان کہتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جن مشکلات کا اِنھیں سامنا ہے وہ بھارت کے مسلمانوں کو درپیش مشکلات کے سامنے کچھ بھی نہیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ احتجاجی مظاہروں میں شرکت ضروری ہو جاتی ہے۔

احتجاجی مظاہروں کے آغاز سے ہی سویتا ٹویٹر کے ذریعے پمفلٹ تقسیم کر رہی ہیں، انھوں نے ایک ویڈیو بھی بنائی ہے، جس میں انھوں نے لوگوں سے احتجاج میں شرکت کی درخواست کی ہے اور اس میں کامیاب بھی ہوئیں، تاہم اپنے خاندان کے حوالے سے انھیں کوئی امید نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''میں نے برسوں کوشش کی، لیکن ان کے خیالات تبدیل نہیں ہوئے''۔ (ترجمہ: محمد عمید فاروقی)

"My father hates Muslims': India's new law divides families". ("aljazeera.com". Dec.25, 2019)

بچوں کے ذہنی و نفسیاتی امراض و مسائل کا مختصر جائزہ

بچوں کے ذہنی امراض

فوزیہ عباس

قیمت: ۳۰۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5
فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ فون: 021-36809201

لیبیا میں بڑھتی کشیدگی اور جنگ بندی کے امکانات

Ben Fishman

لیبیا میں نو ماہ سے جاری خانہ جنگی میں شدت کے بعد یورپی ممالک نے معاملے کے حل کے لیے سفارتی کوششوں میں اضافہ کردیا ہے۔

ترک پارلیمان نے طرابلس میں قائم جی این اے حکومت کی مدد کے لیے فوج بھیجنے کی منظوری دی ہے، جس کے چند دن بعد ہی ترک صدر طیب ایردوان نے ۸ جنوری کو روسی صدر پوٹن سے استنبول میں ملاقات کی اور ۱۲ جنوری سے لیبیا میں جنگ بندی شروع کرنے کا مطالبہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ جنگ بندی ہو یا نہ ہو ماسکو اور انقرہ تشدد کے خاتمے کے لیے اقدامات کریں گے۔ لیبیا میں ترکی اور روس کا بڑھتا ہوا اثر ورسوخ دراصل تنازع کے حل کے لیے مغربی کوششوں کی ناکامی کو ظاہر کرتا ہے۔ لیبیا میں سیاسی اقتدار کی منتقلی اور امن کے لیے وسیع بین الاقوامی کوششوں کی ضرورت ہے، روس اور ترکی ان کوششوں کی حمایت تو کرسکتے ہیں لیکن اس عمل میں قائدانہ کردار ادا نہیں کرسکتے، پوٹن اور ایردوان ملاقات میں بظاہر اس حقیقت کو تسلیم کرتے نظر آئے۔ انہوں نے برلن کانفرنس کے کثیر الجہتی منصوبے کی حمایت بھی کی، جس کے تحت تمام متعلقہ فریقوں کو دشمنی ختم کرنے کے ساتھ سلامتی کونسل کے فیصلوں کا احترام کرنا تھا، لیکن اسلحے پر پابندی کے فیصلے کی وسیع پیمانے پر خلاف ورزی جاری ہے۔ فرض کرلیجیے کہ پوٹن سنجیدہ ہیں اور روس کے لیے لڑنے والوں کو پیچھے ہٹانے کو تیار ہیں۔ لیکن ایک مکمل اور دیرپا جنگ بندی نہیں ہوسکتی جب تک مخالف فریق اور لیبین نیشنل آرمی کے جنرل خلیفہ ہفتر کے حمایتی بات چیت کے آغاز کے بعد ایک مقررہ مدت میں فوجی انخلا کے لیے تیار نہیں ہوجاتے۔ خاص کر متحدہ عرب امارات جس نے جنرل ہفتر کو اہم فضائی برتری مہیا کی ہوئی ہے، اس کے ساتھ ہی ترکی کو بھی کشیدگی ختم کرنے کے لیے یکساں اقدامات کرنا ہوں گے۔ ایران اور عراق میں تنازع میں الجھ جانے کے باوجود امریکا ہی وہ واحد طاقت ہے، جو تمام غیر ملکی فریقوں کو قابل بھروسہ جنگ بندی کے لیے تیار کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ واشنگٹن کو لیبیا میں پائیدار امن کے لیے کوشش کرنی چاہیے، اس سے قبل کہ ملک میں مزید انتشار پھیل جائے۔

ترکی کی مداخلت کے اثرات

روسی ملٹری کنٹریکٹر کے ہفتر کی جانب جھکاؤ کا دباؤ محسوس کرتے ہوئے جی این اے حکومت نے نومبر میں اپنے قابل اعتماد اتحادی ترکی سے مدد کے لیے رابطہ کیا، اس سے قبل انقرہ جی این اے کو بکتر بند گاڑیاں اور ڈرون طیارے فراہم کرچکا ہے، لیکن موسم گرما کے دوران ترکی کی جانب سے رسد کی فراہمی سست کردی گئی۔ نومبر کے آخر میں ترکی نے جی این اے کے ساتھ دو متنازع معاہدے کیے، ایک معاہدے کے تحت ترکی ضرورت پڑنے پر اسلحہ، فوجی اہلکار اور تربیت فراہم کرے گا، جبکہ دوسرا معاہدہ سمندر میں خصوصی معاشی زون کے حوالے سے تھا، جس کے تحت دونوں ممالک کی سمندری حدود بحیرہ روم میں مصر، قبرص اور یونان تک پھیل گئی۔ دسمبر میں جی این اے نے دفاعی معاہدے کی بنیاد پر براہ راست فوجی مدد کی درخواست کی اور انقرہ نے ۲ جنوری کو فوجی تعینات کرنے کی منظوری دے کر معاہدے کی پاسداری کی۔ لیبیا میں ترک مداخلت کا دائرہ اور مقصد تا حال واضح نہیں۔ ایردوان نے ۶ جنوری کو بتایا کہ ترک فوجیں بہتر رابطوں اور تربیتی عمل کا حصہ بنیں گی، انہوں نے زور دیا کہ وہ کسی جنگی کارروائی کا حصہ نہیں ہوں گی۔ اس دوران ترکی نے شامی جنگجوؤں کو بھی جی این اے کی مدد کے لیے بھیجا ہے، جس میں کئی ممالک سے تعلق رکھنے والے جنگجو موجود ہیں، ترکی اس کی تردید کرتا ہے لیکن طرابلس کے امریکی سفارت خانے نے شامی جنگجوؤں کی موجودگی کی تصدیق کی ہے۔ یورپی یونین کا انقرہ کے لیبیا میں کردار کی مخالفت سے اس عمل کو سیاسی دھچکا لگا ہے۔ ترکی اور جی این اے کے درمیان اعلیٰ سطح پر تعاون حالیہ فوجی کشیدگی بڑھانے کی وجہ بنا۔ ہفتر اور اس کے اتحادیوں نے چند ماہ سے اپنے بم حملوں میں اضافہ کردیا ہے، جس سے بے گناہ شہریوں کی ہلاکتوں میں اضافہ ہوا ہے۔ انہوں نے مصراتہ اور طرابلس کے ہوائی اڈوں کو نشانہ بھی بنایا ہے۔ اس میں ایک بڑا میزائل حملہ بھی شامل ہے، جس میں ایئر کیڈٹس کی گریجویشن کی تقریب میں تیس سے زیادہ افراد کو ہلاک کیا گیا۔ حال ہی میں انہوں نے سلفیوں اور قذافی کے حامیوں کی وفاداری تبدیل کرا کے سرت شہر پر قبضہ کرلیا۔ سرت پر قبضہ بہت حیرت انگیز ہے، کیوں کہ ۲۰۱۶ء میں امریکا کو جی این اے کی مدد سے سرت شہر سے داعش کو نکالنے میں چھ ماہ لگ گئے تھے، سرت مصراتہ شہر کو اسٹریٹیجک گہرائی فراہم کرتا ہے، لہٰذا اب ان افواج کو مشرق سے اپنے آبائی شہر کا دفاع کرنا ہوگا، جس سے ان کی مغرب میں طرابلس میں جی این اے کی مدد کرنے کی صلاحیت کم ہوجائے گی۔

پائیدار جنگ بندی

ان فوجی سرگرمیوں کے درمیان سفارتی کوششوں نے بھی زور پکڑا ہے۔ حالیہ ہفتوں میں تیونس اور الجیریا کے صدور نے طرابلس کے دورے کیے، جس کے بعد جی این اے کے وزیر اعظم فیاض السراج نے ۸ جنوری کو برسلز کا دورہ کیا۔ جہاں یورپی یونین کے اعلیٰ اہلکار جوزف بوریل نے پائیدار جنگ بندی اور سیاسی عمل کا ساتھ دینے کے لیے عملی اقدامات کرنے کی یقین دہانی کروائی۔ جس کے بعد جوزف بوریل کی جانب سے فرانس، جرمنی اور اٹلی کے وزرائے خارجہ کے ہمراہ ایک مشترکہ اعلامیہ جاری کیا گیا، جس میں جنگ بندی اور برلن کانفرنس میں شرکت کرکے مذاکرات کی میز پر واپسی کا مطالبہ کیا گیا۔ مشترکہ اعلامیہ میں جی این اے اور ترکی کے یکطرفہ معاہدوں کی مذمت بھی کی گئی، تاہم اعلامیے میں ہفتر کو حاصل بیرونی مدد کے حوالے سے کچھ نہیں کہا گیا۔ اگرچہ یورپی ممالک لیبیا کے معاملے پر پہلے سے زیادہ متحد دکھائی دیتے ہیں، لیکن طویل مدتی استحکام کے لیے ہفتر کے بیرونی اتحادیوں پر طرابلس کے خلاف حملے بند کرانے کے لیے دباؤ ڈالنا ہوگا۔ اس حوالے سے ماضی میں جی این اے سے کوئی سیاسی سمجھوتہ کرنے سے انکار کے پیش نظر صرف ہفتر پر دباؤ ڈالنا لاحاصل ہوگا۔ لیکن مشکلات اس وقت بڑھ جاتی ہیں جب ہفتر کے اہم اتحادی مصر اور عرب امارات اپنی پالیسی میں تبدیلی سے انکار کردیتے ہیں، دراصل قاہرہ اور ابوظہبی کو یقین ہے کہ عالمی سطح پر تسلیم شدہ جی این اے درحقیقت ایک اسلامی ملیشیا ہے اور وہ آسانی کے ساتھ ہفتر میں موجود سلفی عناصر کو نظر انداز کردیتے ہیں۔ ایردوان اسی وجہ سے جی این اے کی حمایت کرتے ہیں، کیوں کہ امارتی اور مصری حکام خطے میں ترک پالیسیوں کی مخالفت کرتے ہیں اور دونوں ممالک ایردوان کو اپنے ملک میں موجود اسلام پسندوں کا سرپرست سمجھتے ہیں۔ متحدہ عرب امارات امریکا کی سفارتی کوششوں کا نقطہ آغاز ہونا چاہیے۔ جب تک ابوظہبی اپنے ڈرون، آپریٹر اور دیگر اہم فوجی مدد واپس نہیں بلاتا لیبیا میں استحکام کے امکانات مدھم رہیں گے۔ ہفتر کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی وجہ سے امارات پر توجہ مرکوز کرنا ہی درست ہے، کیوں کہ دیگر غیر ملکی قوتوں کے پاس کشیدگی کم کرنے کی وجوہات ہیں۔ اگر پوٹن ایردوان کے ساتھ کیا گیا معاہدہ پورا کرتے ہوئے روس اور ترکی میں تصادم کے امکانات محدود کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ روسی فوجی

اہلکاروں کو واپس بلانے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ ترکی نے ابھی تک اپنی فوج کو کوئی مشن نہیں دیا ہے، وہ اپنی شراکت محدود بھی کر سکتا ہے، خاص کر اگر ترکی کو یقین ہو کہ طرابلس کو فوری کوئی خطرہ درپیش نہیں ہے۔ ترکی کی نظر میں طرابلس میں حکومت کا خاتمہ مشرقی بحیرہ روم میں اس کے مفادات کو خطرے میں ڈال دے گا، جس کا دائرہ پورے مشرق وسطیٰ تک پھیل جائے گا۔ مصر کی جانب سے بھی ہفتر کو بہت زیادہ مدد ملنے کا امکان نہیں، کیوں کہ قاہرہ کی بنیادی دلچسپی لیبیا کے ساتھ اپنی سرحد کو محفوظ بنانا ہے۔ صرف واشنگٹن ہی عرب امارات کو یہ بات سمجھا سکتا ہے کہ خلیج فارس میں غیر معمولی بحران کے دوران شمالی افریقا کے دور دراز خطے میں مہم جوئی کرنا کوئی عقلمندی نہیں۔ ابوظہبی کو اپنے وسائل خلیج فارس کی مشترکہ سلامتی پر لگانے چاہییں، امریکا کا سفارتی کردار امارات کو یقین دہانی بھی ہوگی کہ مذاکرات کے دوران اس کے تحفظات کا پورا خیال رکھا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی امریکی حکام کو امارات سے کشیدگی میں کمی کرنے کا مطالبہ کرنا ہوگا، کیوں کہ ماضی میں عرب امارات جنگی تناؤ میں کمی کرنے سے انکار کر چکا ہے۔ واشنگٹن کو ابوظہبی کو نام نہاد اسلام پسندوں کے خلاف لاحاصل کارروائیوں سے روکنا چاہیے اور لیبیا اس حوالے سے شروعات کے لیے اچھی جگہ ہو سکتا ہے۔ امریکی انتظامیہ کو جنگ بندی کے لیے روس کے ساتھ مل کر سلامتی کونسل سے قرارداد منظور کروانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ٹرمپ انتظامیہ نے گزشتہ اپریل اور مئی میں اس حوالے سے اقدامات کی مخالفت کی تھی، لیکن اب ایک اور موقع ہے کہ امریکا پوٹن پر جنگ بندی کے اپنے مطالبے پر عمل درآمد کے لیے دباؤ ڈالے۔ (ترجمہ سید طالوت اختر)

"Ceasefire or escalation in Libya?"
("washingtoninstitute.org". January 10, 2020)

سنکیانگ مظالم

قسط نمبر ۳

رضی الدین سید

چین میں سنکیانگی مسلمانوں پر جو بربریت گزر رہی ہے، اس پر مفتیِ اعظم پاکستان مفتی محمد تقی عثمانی نے سخت تشویش کا اظہار کیا ہے۔ ایک بیان میں انہوں نے کہا ہے ''سنکیانگ کے مسلمانوں کے بارے میں تشویشناک خبریں آرہی ہیں۔ حکومت پاکستان کا فرض ہے کہ وہ چینی مسلمانوں سے متعلق خبروں کی تحقیق کرے اور اپنا اثر ورسوخ استعمال کر کے مسلمانوں کو انصاف دلائے'' (جنگ کراچی، ۵ جنوری ۲۰۲۰ء)

ادھر امریکی اخبار ''نیویارک ٹائمز'' نے اپنی اشاعت مورخہ ۱۶ نومبر ۲۰۱۹ء میں چینی حکام کی جانب سے ایغور مسلمانوں کے خلاف ۴۰ صفحات کا چینی زبان کا حکم نامہ چینی زبان کی عبارت کے ساتھ ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔ اس نے تفصیل سے بتایا ہے کہ وہاں کس بُری طرح مسلمانوں کے ساتھ برتاؤ رکھا جا رہا ہے؟ اخبار لکھتا ہے کہ ''ہانگ کانگ کے چینی مسلم طلبہ جب امتحان دے کر ہوسٹلوں سے واپس گھر لوٹنے لگے تو ان کے ذہن میں تھا کہ اپنے گھر والوں کے ساتھ اب وہ چھٹیاں گزاریں گے اور پورا خاندان دوبارہ اکٹھا ہو جائے گا۔ لیکن، اخبار کہتا ہے کہ معاملہ یہ تھا کہ ان کے گھر والوں کو حراستی تعذیبی عمارتوں میں پہلے ہی سے منتقل کر دیا گیا تھا۔ اعلیٰ حکام کو ہدایت کی گئی تھی کہ لوٹ کر آنے والے طلبہ کو اپنے گھر والوں سے متعلق سوالات پر خاموش رکھا جائے۔ ہدایت نامے میں درج تھا کہ انہیں کہا جائے کہ اگرچہ تمہارے والدین مجرم نہیں ہیں لیکن بہرحال ''تعلیمی اسکولوں'' سے وہ ابھی واپس نہیں لوٹیں گے۔ اگر طلبہ نے کوئی شور شرابہ کیا تو ان کے ساتھ وہ اپنے والدین کے لیے بھی مسئلہ بن جائیں گے۔ سو بہتر یہی ہے کہ آپ لوگ حکومت کے ساتھ تعاون کریں۔ آپ کا تعاونی رویہ ان کے حق میں بھی بہتر نتیجہ دے گا۔

حکام پر زور دیا گیا کہ ''جب طلبہ حیران ہوں کہ اب ان کی فیسیں کون ادا کرے گا اور ان کے گھر کی زمینوں کو کون کاشت کرے گا تو انہیں یہ کہہ کر چینی حکومت کا شکریہ ادا کرنے کی ہدایت کی جائے کہ وہی اب ان کی دیکھ بھال کرے گی۔ انہیں بتایا جائے کہ ان کے گھر والے دہشت گردی سے حفاظت کی تعلیم لے رہے ہیں۔ لیکن اس میں دراصل ایک خفیہ پیغام موجود تھا۔ وہاں انہیں سزائیں دی جا رہی تھیں۔ ہدایت نامے میں مقامی حکام کو تنبیہ کی گئی ہے کہ ان مسلم طلبہ کے ملک بھر میں وسیع و عریض تعلقات ہیں۔ اس لیے وہ کسی بھی اسمارٹ فون یا ٹویٹر سے پیغامات بھیج کر ملک بھر میں آگ بھڑکا سکتے ہیں اور چینی حکومت کے لیے خاصی پریشانی کا سبب بن سکتے ہیں۔ اس لیے لازم ہے کہ طلبہ کی نقل وحرکت پر گہری نظر رکھی جائے۔ واضح رہے کہ چینی صدر نے اپریل ۲۰۱۴ء کو سنکیانگ کا دورہ کرتے ہوئے دوٹوک احکام جاری کیے تھے کہ یہاں کسی بھی قسم کی شرانگیزی ہرگز برداشت نہیں کی جائے گی۔ اسی کے ساتھ سنکیانگی چینی حکام نے عوام میں صدر کی تقریر کے جستہ جستہ اقتباسات بھی لوگوں میں تقسیم کیے تھے۔

سنکیانگ کے ایغور مسلمانوں کے قبرستان کو بھی گذشتہ سال مسمار کر دیا گیا تھا اور اب وہاں ان کے لیے اپنے مرحومین کو دفنانے اور ان کی قبروں کی زیارت کرنے کے لیے بہت سارے مسائل کھڑے ہو گئے ہیں۔ تسلی دی گئی کہ اس علاقے کو خوبصورت بنایا جائے گا۔ فرانس کے چینل ''ایشیا ایکسس'' نے یہ اطلاع فراہم کرتے ہوئے برباد شدہ قبرستان کی ویڈیو بھی جاری کی۔ ویڈیو میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ تعلیمی مرکز میں ایک استاد چند طلبہ کو بلیک بورڈ پر یہ حدیث سمجھا رہا ہے کہ ''وطن کی محبت ایمان کا جزو ہے''۔ ادھر مسلم شہریوں نے خفیہ طور پر تمام مقامی مسلمانوں سے کہا ہے کہ وہ آپس میں اس طرح جڑے رہیں جیسے انار کے دانے باہم جڑے رہتے ہیں۔ (نیویارک ٹائمز، ۱۶ نومبر ۲۰۱۹ء)

واضح رہے کہ سنکیانگ میں جولائی ۲۰۰۹ء میں چینیوں اور ایغوروں کے درمیان گزشتہ عشروں کا سب سے بڑا خونی تصادم ہوا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ جنوبی چین کے ایک کارخانے میں دو مسلم کارکنوں کو چینیوں نے ہلاک کر دیا تھا۔ ایغور مسلمان چونکہ اس بات پر بھی حکومت سے ناراض تھے کہ وہ یہاں ہان چینی لوگوں کو مستقل آباد کر کے مسلمانوں کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کر رہی ہے۔ اس لیے ہلاکت کے واقعہ نے ان میں مزید چنگاری بھڑکا دی اور انہوں نے صوبے بھر میں اس کے خلاف ہنگامہ برپا کر دیا۔ خونی تصادم ہوا، جس میں پہلے ہی دن ۲۰۰ کے قریب لوگ ہلاک ہوئے جن میں سے بیشتر ''ہان'' تھے، جو ملک بھر میں چینیوں کا اکثریتی قبیلہ ہے۔ ہیومن رائٹس واچ کا کہنا ہے کہ کئی افراد غائب بھی کر دیے گئے تھے۔ چینی حکام کا کہنا ہے کہ یہ فسادات بیرونی ایغور تنظیم نے کروایا تھا، تاہم تنظیم کی صدر ''رابعہ قدیر'' کا کہنا ہے کہ حکومت کا یہ الزام محض جھوٹ ہے۔ نومبر ۲۰۰۹ء میں چینی حکام نے ۹ افراد کو پھانسی پر لٹکایا جبکہ مزید ۲۰۰ کو موت کی سزائیں سنائیں۔ (وکی پیڈیا)

عجیب المیہ ہے کہ ایک طرف امریکا و مغرب میں عوامی آزادی کی عمومی فضا پائی جاتی ہے، جہاں ہر مذہب کے لوگ مساوات کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ مسلمان مینار والی اپنی مسجدیں بھی تعمیر کر سکتے ہیں۔ جبکہ ادھر کمیونسٹ چین کی حکومت ہے، جہاں مسلمانوں پر بدترین سینسر اور تشدد ہے۔ مگر اس سے بھی بڑھ کر المیہ یہ ہے کہ سوائے ترکی کے کوئی بھی مسلمان ملک ان لاچار ایغور مسلمانوں کے حق میں آواز بلند کرنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ وہ بے چارے ہمارے بھائی اسی طرح تعذیبی مراکز میں قید رہیں گے اور ان کے اہلِ خانہ ان سے ملنے اور خیر خبر جاننے کے لیے ترستے رہیں گے۔

بنگلا دیش جماعتِ اسلامی: خواتین، جمہوریت اور سیاست

Elora Shehabuddin

''ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ سلم کے پاس آیا اور کہا کہ اللہ کے رسولؐ میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا تمہاری ماں۔ اس نے کہا، ان کے بعد۔ آپؐ نے فرمایا، تمہاری ماں۔ اس نے کہا، ان کے بعد، آپؐ نے فرمایا، تمہاری ماں۔ اس نے کہا، ان کے بعد، آپؐ نے فرمایا، تمہارے والد''۔

بنگلا دیش جماعتِ اسلامی کے راہ نما اور سابق رُکنِ اسمبلی دلاور حسین سعیدی اپنے وعظ کی محفلوں میں، جہاں خواتین اور مرد شرکت کرتے تھے، درج بالا حدیث اس مقصد سے سناتے تھے کہ یہ واضح کیا جائے کہ قرآن، احادیث اور اسلام نے ماں کے کردار کو کس قدر اہمیت دی ہے۔ اس کے بعد حاضرین سے یہ سوال پوچھتے تھے کہ کیا خواتین کو اسلام میں کامیابی میسر آئی یا ناکامی؟ اس پر حاضرین 'کامیابی' کی زوردار آواز بلند کرتے۔

میں اس مضمون میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ بنگلا دیش میں جماعت اسلامی کے راہ نما تسلسل سے اسلام میں ماں کی عزت و احترام کا ذکر کرتے رہے ہیں تاکہ ان غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) کے دعووں کا جواب دے سکیں، جن کا کہنا ہے کہ اسلام خواتین کی ترقی میں حائل رہا ہے۔ بنگلا دیش کے بڑے حصے میں پھیلی ہوئی ان این جی اوز کا یہ بھی کہنا ہے کہ ترقی کا واحد راستہ یہ ہے کہ ہمیں مذہب اور روایت کی زنجیروں سے آزاد ہونا چاہیے۔

جماعت اسلامی کے بانی سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے واضح کیا ہے کہ ''خواتین کے لیے خدا کا بتایا ہوا مقام گھر ہے''۔ اس کے برعکس بانیٔ جماعتِ اسلامی نے خواتین میں ووٹ ڈالنے کی تشویق پیدا کی۔ کچھ عشروں بعد بنگلا دیش میں جماعت اسلامی کے راہ نماؤں نے مزید آگے بڑھ کر یہ واضح کیا کہ اسلام خواتین کو بھی بحیثیت فرد تسلیم کرتا ہے اور فرد کی حیثیت سے ان کی ذمے داری ہے کہ وہ خدا، اسلام اور اسلام کی مدد سے حقوقِ نسواں کا تحفظ کریں اور تعلیم حاصل کریں، کام کریں اور ووٹ دیں۔

جیسا کہ پاکستان کی آزادی کے بعد کے ابتدائی برسوں میں ہوا، جماعت اسلامی نے بنگلا دیش میں بھی فوجی حکمرانی کے خلاف اور جمہوریت کی بحالی کے لیے تحریک چلائی۔ فوجی حکمران حسین محمد ارشاد کی جانب سے ۱۹۸۸ء میں اسلام کو بنگلا دیش کی ریاست کا مذہب قرار دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس پر جماعت اسلامی نے مایوسی کا اظہار کیا۔ جماعت اسلامی چاہتی تھی کہ بنگلا دیش کو ایک اسلامی ریاست قرار دیا جائے۔ جماعت اسلامی نے اس تحریک میں بھی اہم حصہ لیا، جس کی بدولت آئین کی تیرہویں ترمیم منظور کی گئی۔ جس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ قومی سطح کے ہر انتخاب سے پہلے تین ماہ کے لیے نگران حکومت بنے گی اور نگران وزیراعظم ملک کا کوئی ریٹائرڈ چیف جسٹس ہوگا۔ عالمی مبصرین کی موجودگی میں ۱۹۹۱ء، ۱۹۹۶ء اور ۲۰۰۱ء میں جو انتخاب ہوئے انھیں صاف اور شفاف قرار دیا گیا۔ ان تینوں انتخابات میں جماعتِ اسلامی نے حصہ لیا اور کافی تعداد میں پارلیمانی نشستیں جیتیں اور ایک اہم اتحادی جماعت کے طور پر سامنے آئی۔ جماعت کے راہنماؤں نے مجھ سے انٹرویو میں کہا کہ جماعت اسلامی کو انتخاب میں کامیاب ہونے کی کوئی جلدی نہیں۔ انھیں اس بات کا انتظار ہے کہ آبادی کا بڑا حصہ کب اسلامی ریاست کی حمایت کے لیے اٹھتا ہے۔

دنیا بھر کی اسلامی تحریکوں کی طرح بنگلا دیش میں بھی جماعت اسلامی کے مرد اور خواتین ارکان شہروں میں رہنے والے درمیانے طبقے کے تعلیم یافتہ افراد ہیں۔ دنیا کی دیگر اسلامی تحریکات سے جماعت اسلامی اس طرح مختلف ہے کہ جماعت اسلامی کو ایک سیاسی جماعت کے طور پر ایک قومی جمہوری جماعت (National Democratic Party) کے طور پر اجازت دی گئی ہے۔ آج جماعت اپنے اراکین پر منحصر ہے۔ بنگلا دیش کی محروم اور کم تعلیم یافتہ خواتین کو مقامی اور عالمی تنظیموں نے متحرک کیا۔ اس طبقے نے ایک ایسا حلقہ پیدا کیا ہے جسے آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ بنگلا دیش میں غریب خواتین کی بڑھتی ہوئی تعداد، جن کا مطالبہ تعلیم اور ملازمت کا تھا، کی موجودگی میں جماعت اسلامی کو احساس ہوگیا تھا کہ محض درمیانے طبقے کی حمایت کے بل بُوتے پر قومی سطح پر انتخاب میں کامیابی حاصل نہیں کی جاسکتی۔

اقوامِ متحدہ کی جانب سے عشرۂ خواتین [United Nations Decade for Women (1975-1985)] کے بعد عالمی اداروں نے اُن منصوبوں پر لاکھوں ڈالر خرچ کیے، جن کا مقصد ترقی پذیر ممالک کی خواتین تھیں۔ اس ضمن میں بنگلا دیش پر بھی توجہ دی گئی۔ اس کے بعد بنگلا دیش کے افراد اور ادارے نوجوانوں کی تعلیم اور مائیکروفنانس کی بدولت عالمی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ وہاں آج لاکھوں خواتین این جی اوز سے وابستہ ہیں اور ہزاروں این جی اوز مختلف حوالوں سے بنگلا دیش کے دیہاتوں میں موجود ہیں، جن کی وجہ سے وہاں کی سماجی زندگی نہ صرف تبدیل ہوئی ہے بلکہ صنفی رشتوں (gender relations) میں بھی تغیر واقع ہوا ہے۔ یہاں ان چیزوں کے تجزیے کا مقصد یہ ہے کہ ۱۹۹۰ء کے انتخاب میں بہت سی این جی اوز نے ایسے تعلیمی منصوبوں پر کام کا آغاز کیا، جس کا مقصد غیر تعلیم یافتہ ووٹروں کو درست انتخابی فیصلوں سے متعلق آگاہی فراہم کرنا تھا۔ یہ تعلیمی منصوبے ان سماجی منصوبوں کے علاوہ تھے جو وہاں پہلے سے موجود تھے، جن کا مقصد قانونی تعلیم اور خواتین کے حقوق کے بارے میں آگاہی عام کرنا تھا۔ اس سلسلے میں اکثر این جی او غیر جانبدار رہیں۔ کچھ این جی اوز ایسی بھی تھیں، جو اپنے اراکین کے فیصلوں پر اثر انداز بھی ہونا چاہتی تھی۔

بنگلا دیش میں ۱۹۹۶ء کے انتخاب سے پہلے غیر مذہبی اداروں نے آزادی کی ۲۵ سالہ تقریبات کا اہتمام بہ عنوان '۱۹۷۱ء کے آئیڈیلز' (ideals of 1971) کیا۔ ان تقریبات میں ان لوگوں کی سخت مخالفت کی جنھوں نے بنگلا دیش کی آزادی کی مخالفت کی تھی۔ میں نے ان جلوسوں میں شرکت کی جہاں لٹریچر بھی تقسیم کیا گیا۔ اس لٹریچر میں آئیڈیلز کے بارے میں واضح موقف اختیار نہیں کیا گیا۔ مثال کے طور پر ۱۹۷۲ء کے آئین میں ان چار ستونوں کو اہمیت حاصل تھی: نیشنل ازم، جمہوریت، سیکولرازم اور سوشل ازم۔ ان آئیڈیلز میں سوشل ازم کا کہیں ذکر نہ تھا۔

اس موقع پر جو تناؤ سامنے آیا، وہ سیکولر اور اسلام پسندوں کے درمیان تھا۔ کچھ تنظیموں نے واضح طور پر جماعتِ اسلامی کو نشانہ بنایا اور اپنے سامعین کو یاد دلایا کہ اس جماعت کے افراد ۱۹۷۱ء میں بنگلا دیش کی مقامی آبادی کو قتل کرنے اور ان کی عزتیں لوٹنے میں ملوث تھے۔ سامعین کو یہ بھی یاد دلایا گیا کہ اس جماعت نے این جی او اور خاص طور پر ان کی خواتین کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ عوامی لیگ جس نے بنگلا دیش کی آزادی میں مرکزی کردار ادا کیا، اور ۱۹۹۶ء کے انتخابات میں کامیابی حاصل کی، ۲۱ سال بعد دوبارہ حکومت میں آگئی۔

جماعت اسلامی نے ۱۹۹۱ء میں ۱۸ نشستیں حاصل کی تھیں، ۱۹۹۶ء کے انتخاب میں صرف ۳ نشستیں لے سکی۔ جماعت اسلامی اور اس کے مخالفین اس بارے میں متفق نظر آتے ہیں کہ فعال ہونے والا غریب عورتوں کا طبقہ جماعت کی شکست کی وجہ تھا۔ غریب خواتین کا یہ طبقہ جو مسلمان بھی تھا، کی جانب سے جماعت اسلامی کو ووٹ نہ دینے کی وجہ ۱۹۷۱ء کا مسئلہ نہ تھا بلکہ ان خواتین کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ جماعت اسلامی ان کی زندگی میں این جی اوز کی جانب سے آنے والی تبدیلیوں کی مخالفت کرتی تھی۔ میں یہ سمجھتی ہوں کہ اس سبق کے بعد جماعت اسلامی نے خواتین اور غریب طبقے کے بارے میں ازسرنو سوچنا شروع کیا۔ خواتین اپنی تعلیم اور ملازمت کے بارے میں ویسے بھی فکرمند تھیں۔ اس کے علاوہ انھیں اپنے گھروں کے اندر اور باہر محفوظ ماحول بھی درکار تھا۔ ۱۹۹۶ء سے پہلے بھی جماعت اسلامی نے دیہاتوں میں رہنے والی خواتین کے لیے کام کیے تھے، لیکن اب ایک منظم حکمت عملی کے تحت کام کیا گیا، جس میں دیہاتوں اور شہروں میں بسنے والی محروم اور اَن پڑھ خواتین کی حمایت حاصل کی گئی۔

جماعت اسلامی روایتی طور پر اپنے لٹریچر کے ذریعے افراد تک اپنا پیغام پہنچانے کا انتظام رکھتی تھی لیکن اب وعظ کی محفلیں منعقد کی گئیں، جہاں ہزاروں خواتین اور مرد شرکت کرتے تھے۔ وعظ کی ان محفلوں کو سستی ریڈیو کیسٹ میں منتقل کر کے عام کیا گیا، جس میں دلاور حسین سعیدی کے لیکچر ہوا کرتے تھے۔ دلاور حسین سعیدی نے خواتین کی زندگی میں بحیثیت بیٹی، بیوی اور ماں کے وعظ دیے۔ سعیدی صاحب نے اس تصور کو بھی درست کیا جو بنگلادیش کے دیہاتوں میں عام تھا کہ جنت شوہر کے قدموں تلے ہے۔ سعیدی صاحب نے حدیث نبویؐ پیش کی ''ماں کے پیروں تلے جنت ہے''۔ انھوں نے اپنے وعظوں میں بھی عورتوں کے لیے تعلیم حاصل کرنے اور کام کرنے کی اہمیت بیان کی۔ انھوں نے پردے کی اہمیت بھی بیان کی کہ پردے کے بارے میں یہ تاثر غلط ہے کہ پردہ خواتین کی ترقی میں رکاوٹ ہے۔ اصل صورت حال یہ ہے کہ پردہ ایسی ڈھال ہے، جو خواتین کو بُری نظروں سے محفوظ رکھتی ہے۔

''اگر خواتین برقع اُوڑھیں تو راہ چلتا فرد بھی اُن کے بارے میں کوئی لفظ ادا نہیں کرتا۔ اگر آپ برقع پہنے ہوں تو دکان دار بھی آپ کو خالہ ماں یا چاچی ماں کہہ کر مخاطب کرے گا۔ اگر برقع کے بغیر جائیں تو دکان دار آپا کہے گا یا ہنسی مذاق کرے گا۔ جو خواتین برقع اوڑھتی ہیں وہ تمام مشکلات سے اس لیے بھی محفوظ رہتی ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرتی ہیں''۔

بنگلادیش جیسے معاشرے کی خواتین نے اس صورتحال میں کیسا تاثر دیا؟ اس حوالے سے میں نے چٹاگانگ کے پسماندہ علاقوں کی خواتین سے ۲۰۰۱ء کے انتخابات سے پہلے یہ جاننے کے لیے بات چیت کی کہ جماعت اسلامی کے ساتھ اُن کا وقت کیسا گزرا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ آج وہ خواتین نماز درست طریقے سے پڑھ سکتی ہیں، وہ پردے کی اہمیت سے باخبر ہیں، روزے کے احکامات جانتی ہیں اور بہت سی عربی دعائیں جانتی ہیں اور انھیں اپنی روزانہ کی زندگی میں پڑھتی ہیں۔ جماعت اسلامی سے تعلق قائم ہونے کے بعد انہوں نے کہا کہ:

''پردے کے احکامات کے بارے میں آج ہم جو کچھ جانتے ہیں وہ اس سے پہلے نہیں جانتے تھے۔ ہم غیر محرم رشتوں کے بارے میں نہیں جانتے تھے اور نہ اُن سے پردہ کرتے تھے۔ ہم نماز کے بارے میں جانتے تھے کیونکہ اس کے بارے میں ہمارے والدین نے بتایا تھا۔ جب نماز کا وقت ہو جاتا تھا ہم نماز پڑھ لیتے تھے اور آج بھی پڑھتے ہیں۔ آج نماز کو جس اہتمام اور ذمے داری سے پڑھتے ہیں، وہ اس سے پہلے نہ تھا''۔

جماعت اسلامی سے پہلے ان خواتین نے جو اسلام سمجھا وہ غلط تھا۔ ان کی نظر میں جس اسلام کی تبلیغ جماعت اسلامی نے کی وہ صحیح ہے۔ انھیں یقین ہے کہ ان تعلیمات پر عمل کر کے وہ جنت میں جائیں گی۔ جب ان خواتین سے جماعت کی حمایت کرنے کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ جماعت کی حمایت اپنے ذاتی مفاد میں کر رہی ہیں تو وہ اپنے ایمان، عقائد اور حیات بعد موت کی باتیں کرتی ہیں۔

میں نے ایک خاتون سے پوچھا کہ کیا خواتین کے خلاف تشدد اس اسلامی حکومت میں ختم ہو سکے گا، جو خواتین سے پردہ کرنے کا مطالبہ کرتی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ:

''لوگ چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں خواتین پر پانی اور تیزاب پھینکتے ہیں۔ لڑکیوں پر رنگین پانی اور پاؤڈر پھینکتے ہیں۔ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہمارے وطن میں اسلامی ریاست ہوتی اور ہم سچے مسلمان ہوتے تو حکومت لازمی یہ اعلان کرتی کہ خواتین برقع پہنیں۔ تمام خواتین برقع پہنتیں۔ اور اگر حکومت کہتی کہ خواتین برقعے کے بغیر باہر نہ نکلیں تو وہ لازمی برقعے کے بغیر نہ نکلتیں''۔

جماعت اسلامی کے اراکین، پارلیمان میں خواتین کی تعداد میں اضافے کی حمایت کرتے ہیں۔ جماعت اسلامی ۱۹۹۱ء اور ۲۰۰۱ء کے بعد بننے والی حکومتوں میں اتحادی کی حیثیت سے رہی ہے جہاں ایک خاتون دو مرتبہ وزیراعظم رہیں۔ جماعت اسلامی آج بھی انتخابات میں کسی خاتون کو امیدوار نامزد کرنے سے پرہیز کرتی ہے۔ جماعت اسلامی میں محروم طبقے کی بہت سی خواتین شامل ہیں، جو خواتین سیاست دانوں کے خلاف آواز اٹھاتی ہیں۔ میں نے ایک خاتون سے پوچھا جن کا نقطہ نظر یہ تھا کہ کوئی عزت دار خاتون پبلک آفس چلانے کو تیار نہیں ہو سکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مَردوں کی موجودگی میں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

میری تحقیق کے مطابق خواتین کی ایک بڑی اکثریت ایسی ہے جو ان چیزوں کے مخالف سمت میں سوچ رہی ہے۔ اکثر خواتین سیاست میں دلچسپی لے رہی ہیں کیوں کہ ایک خاتون وزیراعظم ہے اور بہت سی این جی اوز علاقائی انتخابات میں خواتین کی مدد کر رہی ہیں۔ اکثر علاقوں میں دیہی خواتین کے پاس موقع ہے کہ وہ اُن طاقتور خواتین سے مل سکیں، جو این جی اوز کی سربراہ ہیں اور ان اہم این جی اوز کی کارکن ہیں۔ اب اکثر خواتین کہتی ہیں کہ 'خواتین اب سب کچھ کر سکتی ہیں'۔

گزشتہ چھ دہائیوں میں جماعت اسلامی نے کم از کم بنگلادیش کی حد تک خود کو بدلتے ماحول کے مطابق تبدیل کیا ہے۔ وہ اشراف اور تعلیم یافتہ افراد کی تنظیم سے ایک سیاسی جماعت میں تبدیل ہو گئی جو جمہوریت پر یقین رکھتی ہے، انتخابات میں حصہ لیتی ہے اور معاشرے میں غریب خواتین کی حمایت چاہتی ہے۔ جماعت اسلامی اپنے پیغامات میں معمولی تبدیلیوں کے بعد اس تاثر کو زائل کرنا چاہتی ہے کہ وہ ووٹوں کی خواہشمند ہے۔

یہ مضمون مجموعہ مقالات بہ عنوان Islamic Reforms in South Asia میں شامل ہے۔ یہ مجموعہ ۲۰۱۳ء میں کیمبرج یونیورسٹی پریس سے شائع ہوا۔ زیرنظر مقالے کا عنوان: Jamaat-i-Islami in Bangladesh: Women, Democracy and the Transformation of Islamist Politics. ہے۔

رائس یونیورسٹی کے شعبہ علوم انسانی و سیاسیات (Humanities and Political Science) سے بحیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر وابستہ ہیں۔ ان موضوعات پر ان کی یہ کتابیں موجود ہیں: Reshaping the Holy: Democracy, Development and Muslim Women in Bangladesh (2008), Empowering Rural Women: The Impact of Grameen Bank in Bangladesh (1992)

Encyclopedia of Women and Islamic Culture کی مدیر ہیں۔ مجلّہ Feminist Economics کی مہمان مدیر ہیں۔ اس موضوع پر آج کل کام کر رہی ہیں: Apostles of Progress: Feminism, Empire, and Muslim Women

(ترجمہ: جاوید احمد خورشید)

دیوندر سنگھ سے اوتار سنگھ تک

افتخار گیلانی

بھارتی دارالحکومت نئی دہلی میں اپنے ۲۷ سالہ صحافتی کیریئر کے دوران میں نے نہ صرف وقائع نگار کی حیثیت سے کشمیر یا بھارت اور پاکستان کے حوالے سے رونما ہونے والے متعدد اعلانیہ یا پس پردہ واقعات کا مشاہدہ کیا، بلکہ نہ چاہتے ہوئے بھی بسا اوقات حالات وحوادثات کا کردار بن گیا۔ پچھلے ہفتے جب خبر آئی کہ جموں وکشمیر پولیس نے اپنے ہی ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ دیوندر سنگھ کو دو عسکریت پسندوں کو جموں لے جاتے ہوئے گرفتار کیا، تو میرے لیے اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ پچھلے ۳۰ برسوں میں کشمیر میں متعدد ایسے واقعات رونما ہوئے، جو عسکریت پسندوں کے کھاتے میں ڈالے گئے، مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یا تو ان میں بھارتی سیکورٹی اداروں کے اہلکار براہ راست ملوث تھے یا جانکاری ہوتے ہوئے بھی انہوں نے ان واقعات کو طول دے کر پروپیگنڈا کے لیے بخوبی استعمال کیا۔ اپنی معرکتہ الآرا تفتیشی کتاب The Meadows میں برطانوی مصنفین ایڈرین لیوی اور کیتھی اسکارٹ نے بتایا ہے کہ ۱۹۹۵ء میں جنوبی کشمیر میں مغربی ممالک کے پانچ سیاحوں کو جب ایک غیر معروف تنظیم الفاران نے اغوا کیا، تو بھارتی خفیہ ایجنسیوں کو ان کے ٹھکانوں کے بارے میں پوری معلومات تھی۔ بھارتی خفیہ ایجنسیوں کے طیارے مسلسل ان کی تصویریں لے رہے تھے۔ مگر ان کو ہدایت تھی، کہ سیاحوں کو چھڑانے کا کوئی آپریشن نہ کیا جائے، بلکہ اس کو طول دیا جائے۔ بعد میں ان سیاحوں کو بھارتی آرمی کی راشٹریہ رائفلز نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ مگر بازیابی کا اعلان کرنے کے بجائے ان کو موت کی نیند سلایا دیا گیا۔ مقصد تھا کہ مغربی ممالک تحریک آزادیٔ کشمیر کو دہشت گردی سے منسلک کر کے اس کی حمایت سے ہاتھ کھینچیں اور جتنی دیر سیاح مبینہ عسکریت پسندوں کے قبضہ میں رہیں گے، پاکستانی مندوبین کے لیے مغربی ممالک میں جواب دینا اتنا ہی مشکل ہو جائے گا۔ اس واقعے کے ایک سال قبل ہی مغربی ممالک انسانی حقوق کی صورت حال کے حوالے سے بھارت پر اقتصادی پابندیاں عائد کرنے پر غور کر رہے تھے۔ یہ واقعہ واقعی کشمیر کی جدوجہد میں ایک تاریخی موڑ ثابت ہوا۔

اسی طرح جب معروف قانون دان اور حقوق انسانی کے کارکن جلیل اندرابی کے قتل میں ملوث میجر اوتار سنگھ کے خلاف کارروائی کرنے کے لیے عدلیہ نے سیکورٹی ایجنسیوں پر دباؤ ڈالا، تو مذکورہ میجر کو راتوں رات پاسپورٹ اور ٹکٹ دے کر کینیڈا پہنچایا گیا۔ بعد میں وہ وہاں سے امریکا منتقل ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ ۲۰۱۲ء میں وہ خود ہی مکافاتِ عمل کا شکار ہوگیا۔ جب امریکا میں اس کی موجودگی کا پتا چلا تو اس نے دھمکی دی کہ اگر اس کو بھارت ڈیپورٹ کیا گیا تو وہ کئی راز طشت ازبام کرے گا، جس کی لپیٹ میں سیکورٹی اداروں کے اعلیٰ ذمہ داران آئیں گے۔ دیوندر سنگھ کا نام نہ صرف ۲۰۰۱ء میں بھارتی پارلیمان پر ہوئے دہشت گردانہ حملہ میں آیا تھا، بلکہ جولائی ۲۰۰۵ء میں دہلی سے متصل گڑگاؤں میں دہلی پولیس نے ایک مقابلے کے بعد چار افراد کو گرفتار کیا تھا۔ ان کے پاس ایک پستول اور ایک وائرلیس سیٹ برآمد ہوا۔ گرفتار شدہ افراد نے دہلی پولیس کو ایک خط دکھایا، جو جموں وکشمیر سی آئی ڈی محکمہ میں ڈی ایس پی دیوندر سنگھ نے لکھا تھا، جس میں متعلقہ سیکورٹی ایجنسیوں کو ہدایت دی گئی تھی کہ ان افراد کو ہتھیار اور وائرلیس کے ساتھ گزرنے کے لیے محفوظ راہداری دی جائے۔ دہلی پولیس نے سرینگر جا کر دیوندر سنگھ سے اس خط کی تصدیق مانگی اور ان کی رہائش گاہ پر چھاپہ بھی مارا، جہاں سے انہوں نے اے کے رائفل اور اسلحہ برآمد کیا۔ یہ سب دہلی کی ایک عدالت میں دائر چارج شیٹ میں درج ہے۔ مگر دیوندر سنگھ کو گرفتار کرنے اور اس واقعے کی مزید تفتیش کرنے کی کسی کو بھی ہمت نہیں ہوئی۔

مجھے یاد ہے کہ ۲۰۰۲ء میں جب دہلی کی پٹیالہ ہاؤس کی سیشن عدالت میں پارلیمنٹ پر ہوئے دہشت گردانہ حملہ کی سماعت چل رہی تھی، میں بھی ان دنوں دہلی کی تہاڑ جیل میں قید تھا۔ افضل گورو اور پارلیمنٹ حملے کے ملزمان تو ہائی سیکورٹی وارڈ میں بند تھے، مجھے جنرل وارڈ میں منتقل کیا گیا تھا۔ بیرک میں میرے ساتھ قتل کے الزام میں ایک قیدی امبیر سنگھ کی سماعت بھی ایس این ڈھنگرہ کی عدالت میں چل رہی تھی، جہاں پارلیمنٹ کیس زیر سماعت تھا۔ اپنی سماعت کے انتظار میں امبیر بغور پارلیمنٹ کیس کی کارروائی کا مشاہدہ بھی کرتا تھا۔ ایک بات بتاؤں کہ عادی مجرموں کو قانون کی حس اور ججوں کے موڈ وغیرہ کی ایسی معلومات ہوتی ہیں کہ بڑے سے بڑا زیرک وکیل بھی ان کے سامنے پانی بھرے۔ وہ بس جج اور وکیل کا نام سن کر ہی بتاتے تھے کہ کیس کون سا رخ اختیار کرے گا۔ ایک روز عدالت سے واپسی کے بعد امبیر نے میرے پاس آ کر بتایا کہ پارلیمنٹ کیس میں افضل کا وکیل ٹھیک طرح سے بحث نہیں کر رہا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ وکیل صاحب، جو سرکار نے مہیا کروائی تھی، اس کو پھانسی کے تختے کی طرف لے جا رہی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ کسی طرح افضل کو اطلاع کروائے کہ اس کا کیس غلط رخ اختیار کرتا جا رہا ہے۔ خیر میں تو خود اپنے کیس میں الجھا ہوا تھا اور مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ میرے کیس کا کیا انجام ہوگا، پھر ہائی سیکورٹی وارڈ میں پیغام پہنچانا میرے بس میں نہیں تھا۔ آخر ایک دن جب مجھے عدالت میں پیشی کے لیے لے جایا جا رہا تھا، جیل آفس کے پاس جیل کی گاڑی کا انتظار کرتے ہوئے افضل اور ایس اے آر گیلانی بھی موجود تھے۔ خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد میں نے ان کو کم وبیش وہی کہا، جو امبیر نے مجھے بتایا تھا۔ افضل نے بس میری طرف دیکھ کر کہا کہ میں اپنے کام سے کام رکھوں اور اپنے کیس کی فکر کروں۔ جس اعتماد کے ساتھ اس نے گفتگو کی، مجھے لگا کہ اس کو شاید کسی نے اطمینان دلایا ہے کہ وہ بری ہو جائے گا۔ ان کو جب سزا ہوئی، تو میں ان دنوں بھی جیل ہی میں تھا۔ باہر نکلنے کے بعد معلوم ہوا کہ انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والے چند وکلا اور سرینگر میں بھی چند خیر خواہوں نے ان کو کیس لڑنے کی پیشکش کی تھی، جو انہوں نے ٹھکرائی تھی۔ آخر کیوں؟ اس کا جواب مجھے کبھی نہیں مل پایا۔ ہائی کورٹ میں جب پارلیمنٹ کیس کی سماعت ہو رہی تھی، تو افضل کی اہلیہ تبسم نے ایک خط لکھ کر دہائی دی کہ دیوندر سنگھ نے ان کے شوہر کو حکم دیا تھا کہ چند افراد کو دہلی لے جا کر ان کے لیے رہائش کا بندوبست کرائے۔ ان ہی افراد نے بعد میں پارلیمنٹ پر دھاوا بول کر بھارت اور پاکستان کو جنگ کے دھانے پر کھڑا کر دیا تھا۔ آخر یہ پانچ افراد اور ان کا سرغنہ محمد کون تھا اور ان کا دیوندر سنگھ کے ساتھ کیا رشتہ تھا؟ یہ افراد دہلی آنے سے قبل سیکورٹی فورسز کے کیمپ میں کیا کر رہے تھے؟ تبسم کا کہنا تھا کہ افضل کو سیشن عدالت نے اس کے اقبالیہ بیان کی وجہ سے سزائے موت دی، مگر اسی اقبالیہ بیان کے اس حصے کو حذف کیا، جس میں دیوندر سنگھ کا ذکر تھا۔ تبسم نے لکھا کہ ''۱۹۹۷ء میں شادی سے قبل افضل نے کشمیر میں دواؤں اور سرجیکل آلات کی ایک چھوٹی سی دکان کھولی تھی۔ وہ اپنے خاندان کے ساتھ عام زندگی بسر کرنا چاہتے تھے لیکن سیکورٹی فورسز نے ان کی زندگی اجیرن کر دی۔ سیکورٹی فورسز کی طرف سے ان پر جاسوس بننے کے لیے مسلسل دباؤ ڈالا جاتا رہا۔

جب افضل اس کے لیے آمادہ نہیں ہوئے تو ان پر اذیتوں کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ ۲۲ ویں راشٹریہ رائفلز کے میجر رام موہن رائے نے ان کے شوہر پر اذیتوں کی انتہا کر دی۔ ان کے پوشیدہ اعضا پر بجلی کے جھٹکے لگائے گئے، سر عام گالیاں دی گئیں اور بے عزتی کی گئی، حالانکہ ان کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ ایک عام انسان کی طرح زندگی بسر کرنا چاہتے تھے''۔ سیکورٹی فورسز والے افضل کو اکثر اٹھا کر اپنے کیمپوں میں لے جایا کرتے تھے، جہاں انہیں ٹارچر کیا جاتا اور بلاوجہ مارا پیٹا جاتا تھا۔ بعد میں یہ کام جموں و کشمیر کے اسپیشل آپریشن گروپ یعنی ایس او جی نے سنبھال لیا۔ ایس او جی والے انہیں پاہالن پٹن اور پھر ہمہامہ بڈگام لے گئے۔ وہاں بھی انہیں اذیتیں دی گئیں۔ وہاں ڈی ایس پی ونئے گپتا اور دیویندر سنگھ نے ان کی رہائی کے بدلے ایک لاکھ روپے کا مطالبہ کیا۔ تبسم نے اپنے شوہر کی رہائی کے لیے اپنے تمام زیورات فروخت کر دیے۔ ایس او جی کے کیمپ میں ان کے شوہر کو یخ بستہ پانی میں رکھا جاتا تھا۔ شانتی سنگھ نامی ایک افسر نے تو زیادتی کی انتہا کر رکھی تھی۔ ''اس نے میرے شوہر کو انتہائی سردی کی حالت میں ننگا کر کے الٹا لٹکا دیا اور کئی گھنٹوں تک الٹا لٹکائے رکھا''۔ تبسم نے خط میں سوال کیا تھا ''کہ آخر سیکورٹی فورسز والے ان کے شوہر کو جاسوس کیوں بنانا چاہتے تھے؟'' افضل تو سکون کے ساتھ اپنے خاندان کے ساتھ رہنا چاہتے تھے لیکن سیکورٹی فورسز والوں نے آخر انہیں ایسا کرنے کیوں نہیں دیا؟'' ایک دن دیویندر سنگھ نے ان کے شوہر سے کہا کہ انہیں ایک آخری کام دیا جائے گا اس کے بعد وہ ان کی دسترس سے دور ہوں گے۔ ان کو ایک شخص کو کشمیر سے دہلی لے جانے کے لیے کہا گیا۔ جب وہ ایس او جی کے کیمپ میں پہنچے تو وہاں ان کی ملاقات محمد اور طارق نامی دو افراد سے کرائی گئی۔ انہیں ان دونوں کے بارے میں کچھ بھی پتا نہیں تھا اور نہ ہی یہ جانتے تھے کہ آخر ان سے یہ کام کیوں لیا جا رہا ہے۔ تبسم کہتی ہیں کہ افضل نے یہ تمام باتیں عدالت کو بھی بتائیں لیکن عدالت نے دو افراد کو لانے کا ان کا اعترافی بیان تو قبول کر لیا، تاہم اس بات کو یکسر نظر انداز کر دیا کہ ان دونوں سے ان کی ملاقات کہاں ہوئی تھی۔ وہ مزید کہتی ہیں کہ نچلی عدالت میں انہیں اپنے دفاع کا کوئی موقع نہیں دیا گیا۔ اعلیٰ عدالت نے بھی گواہوں کے ساتھ دوبارہ جرح کرنے اور اسپیشل آپریشن گروپ کو عدالت کے کٹہرے میں بلانے کی ان کی درخواست ٹھکرا دی۔ ۲۰۱۳ء میں افضل گورو کی پھانسی کے بعد کو کہ پارلیمنٹ پر حملے کا ایک باب تو بند ہو گیا لیکن وہ اپنے پیچھے کئی بڑے سوالات چھوڑ گیا۔ عدالت عظمیٰ نے افضل گورو کو پھانسی کی سزا سناتے وقت ''سماج کے اجتماعی ضمیر کو مطمئن'' کرنے کا جواز پیش کیا تھا۔ ۳۰۰ سے زائد صفحات پر مشتمل اپنے فیصلے میں عدالت نے کہا تھا کہ پارلیمنٹ پر حملے کے معاملے میں مجرم کو صرف موت کی سزا ہی سماج کے اجتماعی ضمیر کو مطمئن کر سکتی ہے۔ اسی طرح فروری ۱۹۹۶ء رمضان کا مہینہ تھا۔ دہلی میں ایک سفارت کار کے یہاں میں ایک افطار پارٹی میں مدعو تھا۔ وہاں کشمیر کے معروف قانون دان جلیل اندرابی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ سیکورٹی فورسز کے خلاف کئی کیسوں کی پیروی کرنے کی وجہ سے وہ خاصا نام کما چکے تھے۔ وہ بتا رہے تھے کہ ان کو کشمیر میں دھمکیاں موصول ہو رہی ہیں۔ چند روز قبل ان کے گھر پر چند نامعلوم افراد ان کو اغوا کرنے کی نیت سے آئے تھے۔ اپنے مکان کی بالائی منزل میں چھپ کر انہوں نے ان کی کیمرے سے تصویریں اتاری تھیں۔ ان کی اہلیہ ان افراد سے بحث کر رہی تھی کہ کالونی کے دیگر افراد اکٹھے ہوئے اور وہ فرار ہو گئے۔ کیمرے کے ساتھ جلیل پہلی فرصت میں فلائٹ لے کر دہلی آ پہنچے۔ ان افراد کی شناخت آرمی کے راشٹریہ رائفلز کے راول پورہ کیمپ کے انچارج میجر اوتار سنگھ کے مخبروں کے طور پر ہو گئی تھی۔ دہلی میں انہوں نے وزیر داخلہ ایس بی چوان، نائب وزیر داخلہ راجیش پائلٹ، امریکی سفیر فرینک وائزنر اور دیگر راہنماؤں سے ملاقاتیں کیں اور ان کو بتایا کہ ان کی زندگی کو خطرہ لاحق ہے اور ان کی جان کی حفاظت کی جائے۔ یاد آتا ہے کہ انہوں نے مجھے بھی یہ تصویریں دکھائی تھیں۔ جلیل اندرابی نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا ان کا سری نگر واپس لوٹنا مناسب رہے گا۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ چونکہ انہوں نے اپنی جان کو لاحق خطرہ کے بارے میں حکومت وقت کے اعلیٰ ترین ارباب حل وعقد کو آگاہ کر دیا ہے اس لیے اگر ایسے لوگوں کا سرکار سے کسی بھی طرح کا تعلق ہوگا تو وہ آپ کو نقصان پہنچانے کی اب شاید جرأت نہیں کریں گے۔ اس محفل میں موجود دیگر افراد کی بھی یہی رائے تھی۔ چونکہ عید کے دن قریب تھے اس لیے وہ میرے مشورے اور سیاسی لیڈروں اور رہنماؤں کی یقین دہانیوں سے کسی طرح مطمئن ہو کر بادل ناخواستہ سری نگر لوٹ گئے۔ لیکن ہمارا مشورہ اور ہماری امیدیں غلط ثابت ہوئیں۔ عید کے روز ۸ مارچ ۱۹۹۶ء کو جب جلیل اندرابی اپنی اہلیہ کے ساتھ اپنی کار میں گھر لوٹ رہے تھے کہ میجر اوتار سنگھ کی سربراہی میں مسلح سیکورٹی اہلکاروں نے انہیں روکا اور کار سے اتار کر اپنی گاڑی میں لے گئے۔ اسی شام کو تھانے میں اغوا کا ایک کیس درج کرایا گیا۔ اس دوران جموں و کشمیر ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن نے ہائی کورٹ میں ایک عرضی بھی دائر کی لیکن آرمی اور بی ایس ایف نے جلیل اندرابی کی حراست کی تردید کی۔ جلیل اندرابی کے اغوا کے ۱۹ روز بعد ۲۷ مارچ کو جہلم میں ان کی لاش بہتی ہوئی ملی۔ ان کے سر پر گولیاں ماری گئی تھیں اور ان کا بدن زخموں سے چھلنی تھا۔ ان کی لاش ملتے ہی حکومت نے ایک خصوصی تفتیشی ٹیم تشکیل دے دی جس نے معمول کی کارروائیوں اور تفتیش کے بعد بالآخر ۱۰ اپریل ۱۹۹۷ء کو عدالت میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس رپورٹ میں میجر اوتار سنگھ کا نام لیا گیا تھا۔ عدالت نے مرکزی حکومت کو میجر اوتار سنگھ کا پاسپورٹ ضبط کرنے اور نیا پاسپورٹ فراہم کرنے سے روکنے کا حکم دیا۔ اس نے میجر کی سروس فائلیں بھی چار ہفتے کے اندر پیش کرنے کی ہدایت دی۔ چونکہ کیس ایک معروف قانون دان کا تھا، جموں و کشمیر ہائی کورٹ نے میجر اوتار سنگھ کی گرفتاری کے احکامات صادر کر دیے۔ مگر اوتار سنگھ روپوش ہو چکا تھا۔ ۲۰۱۲ء میں ۴۷ سالہ میجر نے امریکی شہر کیلیفورنیا میں اپنی بیوی اور دو بچوں کو قتل کرنے کے بعد اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ میجر نے مقامی پولیس کو فون کر کے پہلے اپنے کنبے کو ہلاک کرنے کے بدترین جرم کی اطلاع دی جس کے بعد اپنی زندگی کا بھی خاتمہ کر لیا۔ پولیس کے مطابق اوتار سنگھ کی بیوی اور تین سالہ بچے کی لاشیں ان کے بیڈروم میں ملیں۔ اس کے دوسرے بیٹے، جس کی عمر پندرہ سال بتائی گئی ہے کی لاش دوسرے کمرے میں پائی گئی، خود اوتار سنگھ کی لاش بھی ایک کمرے میں ملی۔ اس کے علاوہ پولیس نے اوتار سنگھ کے ایک اور بیٹے، جس کی عمر سترہ سال بتائی گئی ہے کو انتہائی زخمی حالت میں مکان سے برآمد کیا۔ یہ انصاف کا گلا گھونٹ دینے کا ہی انجام تھا کہ میجر اوتار سنگھ کے بیوی اور بچے بھی ان کے خونی کھیل کا شکار ہونے سے بچ نہیں سکے۔ ان کے سیاہ کارناموں کی فہرست اتنی طویل تھی کہ شاید ہی دنیا کی کوئی عدالت انہیں اُن کے گناہوں کے برابر اور قرار واقعی سزا دیتی۔ اوتار سنگھ نے ۹۰ کی دہائی میں کشمیر میں اپنی تعیناتی کے دوران مبینہ طور پر متعدد بے گناہوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ حکومت میجر کی ظالمانہ حرکتوں اور بھیانک جرائم سے پوری طرح واقف تھی، مگر اس کے باوجود نہ صرف انہیں ملک سے بھاگنے میں سرکاری طور پر مدد فراہم کی گئی بلکہ امریکا میں اپنا بزنس قائم کرنے اور قانون کے شکنجے سے دور رکھنے کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ یہ قتل ایسے لوگوں نے کیا تھا جو کشمیر میں حکومت کی نمائندگی کرتے تھے، جو خود کو قانون سے بالاتر سمجھتے تھے، جنہیں غیر قانونی حرکتوں پر کسی طرح کی شرمندگی یا پشیمانی نہیں تھی اور جنہیں قانون و انصاف کا کوئی خوف نہیں تھا۔۔۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ چاہے دیویندر سنگھ ہو یا اوتار سنگھ: لاکھ بیٹھے کوئی چھپ کے کمین گاہوں میں، خون خود بتاتا ہے جلادوں کے مسکن کا سراغ۔

(بحوالہ: روزنامہ ''۹۲ نیوز'' کراچی۔ ۲۱ جنوری ۲۰۲۰ء)

کورونا وائرس کیا ہے؟

فیصل ظفر

یہ وائرس جسے ''۲۰۱۹ء نول کورونا'' یا ''این کوو'' کا نام دیا گیا ہے، کے بارے میں سب سے پہلے عالمی ادارہ صحت نے ۳۱ دسمبر کو بتایا تھا اور جب سے اس کے بارے میں تحقیقات کی جارہی ہیں۔

چین کے سائنسدانوں نے اسے وائرس کے ایک خاندان کورونا وائرسز سے جوڑا ہے، جس میں ۲۰۰۰ء کی دہائی کا خطرناک سارس وائرس بھی شامل ہے۔

سائنسدان اب تک پوری طرح اس نئے وائرس کی تباہ کن صلاحیت کو سمجھ نہیں سکے ہیں جبکہ محققین نے اب اس کی ابتدا، اس کی منتقلی اور پھیلاؤ کے بارے میں تعین کرنا شروع کیا ہے۔

چین کی جانب سے اس کے پھیلاؤ کے حوالے سے بڑے پیمانے پر اقدامات کیے گئے ہیں جبکہ عالمی ادارہ صحت کی خصوصی کمیٹی نے جنوری کے آخری ہفتے میں اسے عالمی سطح پر عوامی ایمرجنسی قرار دیا۔

اس وائرس کے بارے میں صورتحال بہت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے اور اب اس پراسرار وائرس کے بارے میں آپ وہ سب کچھ جان سکیں گے، جو اب تک سامنے آچکا ہے اور ایسے کیا اقدامات کیے جاسکتے ہیں، جن سے آپ اس میں مبتلا ہونے کا خطرہ کم کرسکتے ہیں۔

کورونا وائرس ہے کیا؟

کورونا وائرس کو جراثیموں کی ایک نسل Coronaviridae کا حصہ قرار دیا جاتا ہے اور مائیکروسکوپ میں یہ نوکدار رنگ جیسا نظر آتا ہے، اور نوکدار ہونے کی وجہ سے ہی اسے کورونا کا نام دیا گیا ہے، جو اس کے وائرل انویلپ کے ارگرد ایک ہالہ سے بنا دیتے ہیں۔

کورونا وائرسز میں آر این اے کی ایک لڑی ہوتی ہے اور وہ اس وقت تک اپنی تعداد نہیں بڑھا سکتے جب تک زندہ خلیات میں داخل ہو کر اس کے افعال پر کنٹرول حاصل نہیں کرلیتے، اس کا نوکدار حصہ ہی خلیات میں داخل ہونے میں مدد دیتا ہے بالکل ایسے جیسے کسی دھماکا خیز مواد سے دروازے کو اڑا کر اندر جانے کا راستہ بنایا جائے۔

ایک بار داخل ہونے کے بعد یہ خلیے کو ایک وائرس فیکٹری میں تبدیل کردیتا ہے اور مالیکیولر زنجیر کو مزید وائرسز بنانے کے لیے استعمال کرنے لگتا ہے اور پھر انہیں دیگر جگہوں پر بھیجنے لگتا ہے، یعنی یہ وائرس دیگر خلیات کو متاثر کرتا ہے اور یہی سلسلہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔

عموماً اس طرح کا وائرس جانوروں میں پایا جاتا ہے جن میں مویشی، پالتو جانور، جنگلی حیات جیسے چمگادڑ میں دریافت ہوتا ہے اور جب یہ انسانوں میں منتقل ہوتا ہے تو بخار، سانس کے نظام کے امراض اور پھیپھڑوں میں ورم کا باعث بنتا ہے۔

ایسے افراد جن کا مدافعتی نظام کمزور ہوتا ہے، یعنی بزرگ یا ایچ آئی وی۔ایڈز کے مریض وغیرہ، ان میں یہ وائرس نظام تنفس کے سنگین امراض کا باعث بنتے ہیں۔

سارس یا مرس جیسے کورونا وائرسز آسانی سے ایک سے دوسرے فرد میں منتقل ہوجاتے ہیں، سارس وائرس ۲۰۰۰ء کی دہائی کی ابتدا میں سامنے آیا تھا اور ۸ ہزار سے زائد افراد کو متاثر کیا تھا، جس کے نتیجے میں ۸۰۰ کے قریب ہلاکتیں ہوئیں۔

مرس ۲۰۱۱ء کی دہائی کے ابتدا میں نمودار ہوا اور ڈھائی ہزار کے قریب افراد کو متاثر کیا، جس سے ۸۵۰ سے زائد ہلاکتیں ہوئیں۔

یہ نیا وائرس کہاں سے سامنے آیا؟

۲۰۱۹ء نول کورونا وائرس بظاہر چین کے شہر ووہان کی سی فوڈ ہول سیل مارکیٹ سے پھیلنا شروع ہوا۔

ووہان ایک کروڑ ۱۰ لاکھ سے زائد آبادی کا شہر ہے اور اس مارکیٹ میں مچھلیوں کے ساتھ ساتھ دیگر جانوروں جیسے چمگادڑ اور سانپ کا گوشت بھی فروخت کیا جاتا ہے اور وائرس سامنے آنے کے بعد اس مارکیٹ کو یکم جنوری کو بند کردیا گیا۔

ماضی میں پھیلنے والے وبائی امراض میں بھی مارکیٹیں ان کے آغاز اور پھیلاؤ کا باعث ثابت ہوئی ہیں اور اب تک جن افراد میں اس وائرس کی تصدیق ہوئی ہے، ان میں سے بیشتر حالیہ ہفتوں میں ووہان سی فوڈ مارکیٹ میں جاچکے تھے، یعنی یہ مارکیٹ وائرس کی ابتدا کے معمے کا اہم حصہ ہے، مگر سائنسدانوں کو فی الحال مختلف تجربات اور ٹیسٹوں کے بعد اس کی تصدیق کرنا ہوگی۔

طبی جریدے جنرل آف میڈیکل وائرولوجی میں شائع ایک رپورٹ میں چین کے محققین نے عندیہ دیا تھا کہ سانپوں میں ۲۰۱۹ء نول کورونا وائرس کے پھیلاؤ کا باعث بننے والا ممکنہ جاندار ہے، اس مقصد کے لیے انہوں نے وائرس کے جینیاتی کوڈ کا تجزیہ کرنے کے بعد اس کا موازنہ دو اقسام کے سانپوں میں چینی کوبرا اور کرایت سے کیا گیا۔ محققین کے مطابق سانپوں کا جینیاتی کوڈ اور اس وائرس میں بہت زیادہ مماثلت پائی جاتی ہے۔

مگر اس تحقیق کے فوری بعد ۲ دیگر تحقیقی رپورٹس میں اس دعوے کو مسترد کرتے ہوئے کہا گیا کہ اس وائرس کو پھیلانے والا جاندار چمگادڑ ہے۔

چین کے ہی سائنسدانوں کے ایک گروپ نے ایک آن لائن مقالے میں کہا کہ انہوں نے وائرس کے جینیاتی کوڈ کا موازنہ پہلے کے سارس کورونا وائرس اور چمگادڑ کے دیگر کورونا وائرسز سے کیا اور انہوں نے گہرائی میں جینیاتی مماثلت کو دریافت کیا۔

یہ وائرس اپنے جینز کے ۸۰ فیصد حصے کو ماضی کے سارس وائرس اور چمگادڑوں میں پائے جانے والے کورونا وائرس کے ۹۶ فیصد حصے سے شیئر کرتا ہے، سب سے اہم بات یہ تھی کہ تحقیق میں ثابت کیا گیا کہ یہ وائرس خلیات پر بالکل اسی طرح داخل اور کنٹرول کرسکتا ہے جیسا سارس کرتا ہے۔

ماضی کی دریافتوں سے قطع نظر اب بھی اس نئے وائرس

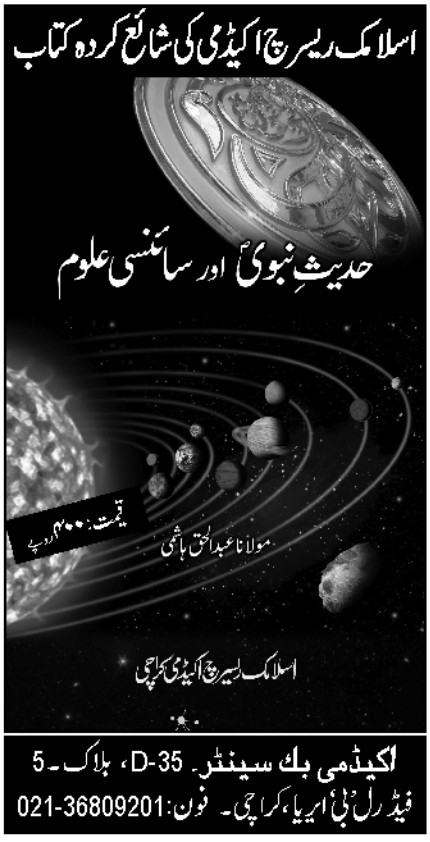

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5
فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ فون: 021-36809201

کی بنیادی حیاتیاتی معلومات کے بارے میں جاننے کے لیے بہت کچھ باقی ہے اور پھر مستند طور پر بتایا جاسکے گا کہ کون سا جانور انسانوں میں اس کی منتقلی کا باعث بنا، فی الحال سانپ اور چمگادڑوں کو ہی اس کا سبب سمجھا جارہا ہے۔

اس نئے کورونا وائرس کے بارے میں ہم کیا جانتے ہیں؟

چائنیز سینٹر فار ڈیزیز کنٹرول اینڈ پریوینٹیشن نے ووہان میں سائنسدانوں کی ایک ٹیم بھیج کر اس نئے وائرس کے بارے میں تفصیلات اکٹھی کی اور مریضوں کے ٹیسٹ کیے تاکہ اسے کنٹرول کرنے کے اقدامات پر غور کیا جاسکے۔

نیو انگلینڈ جرنل آف میڈیسن میں اس ٹیم کے نتائج کو شائع کیا گیا جن کے مطابق ۳ مریضوں کے نمونوں کا تجزیہ کیا گیا، الیکٹرون مائیکروسکوپ کو استعمال کرکے جینیاتی کوڈ پر تحقیق کی گئی اور اس کے بعد ٹیم پہلی بار ناول کورونا وائرس کو دیکھنے اور جینیاتی طور پر شناخت کرنے میں کامیاب ہوئی۔

جینیاتی کوڈ کو سمجھنے سے سائنسدانوں کو ۲ پہلوؤں کے بارے میں سمجھنے میں مدد مل سکے گی، یعنی انہیں ایسے ٹیسٹ بنانے میں کامیابی حاصل ہوسکتی ہے جو مریضوں کے نمونوں میں اس وائرس کی شناخت کرسکے اور ویکسین یا طریقہ علاج کو تشکیل دینے میں مدد مل سکے گی۔

یہ وائرس کس طرح پھیل رہا ہے؟

یہ ایسا اہم سوال ہے جس کے جواب کے لیے سائنسدان سخت محنت کررہے ہیں، ایسا مانا جارہا ہے کہ پہلی بار یہ انفیکشن جانور سے انسان میں منتقل ہوا، مگر اس کے بعد قوی امکانات ہیں کہ ایک سے دوسرے انسان میں یہ منتقل ہورہا ہے۔

مینیسوٹا یونیورسٹی کے Infectious ڈیزیز ریسرچ اینڈ پالیسی کے مطابق چین میں ہیلتھ ورکر اس وائرس سے متاثر ہوئے ہیں، سارس کی وبا پھیلنے کے دوران یہ نمایاں نقطہ ثابت ہوا تھا کیونکہ ہیلتھ ورکر ایک سے دوسرے ملک جاتے ہوئے اس بیماری کو پھیلاتے رہے۔

چینی انتظامیہ نے طبی عملے میں وائرس کی تصدیق کرتے ہوئے عندیہ دیا تھا کہ یہ ایک سے دوسرے انسان میں منتقل ہوا ہے اور سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ سب سے بڑا خدشہ اسپتالوں میں وبا کا پھیلنا ہوسکتا ہے جو سارس اور مرس کورونا وائرسز میں بھی دیکھا گیا تھا، اس حوالے سے اقدامات کی ضرورت ہے۔

ووہان میں حکام مریضوں کے علاج کے لیے ایک ہزار بستروں کا اسپتال ۱۰ دنوں میں تعمیر کررہے ہیں کیونکہ اس وقت اسپتالوں میں گنجائش کی کمی کا سامنا ہے اور یہ نیا اسپتال ۳ فروری کو کھل سکتا ہے۔

چین نے وائرس کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے ووہان شہر کو ہی مکمل طور پر بند کردیا اور سفری پابندیاں عائد کی گئیں جن کا اطلاق بعد میں ۱۴ اور پھر ۸ مزید شہروں تک کیا گیا۔

یہ پابندیاں اس وقت عائد کی گئیں جب چین میں نئے قمری سال کا آغاز ہوا، اس موقع پر چینی شہروں میں لوگوں کی نقل وحمل میں بہت زیادہ اضافہ ہوتا ہے، بیجنگ میں اہم تقریبات کو منسوخ کیا گیا اور یہ تمام پابندیاں اور بندشیں غیر معینہ مدت تک برقرار رہیں گی۔

چینی حکومت نے یہ عندیہ بھی ظاہر کیا ہے کہ یہ وائرس علامات کے نمودار ہونے سے قبل ہی ایک سے دوسرے انسان میں منتقل ہوسکتا ہے، کیونکہ مرض ظاہر ہونے سے پہلے کی علامات ایک سے ۱۴ دن تک ظاہر نہیں ہوتیں اور اس وقت تک مریض خود کو صحت مند سمجھتا ہے، تاہم اس حوالے سے ماہرین کا کہنا ہے کہ ابھی یقینی طور پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ مدت کتنی ہے، ابھی تعین نہیں کیا جاسکتا۔

علامات کیا ہیں؟

اس نئے کورونا وائرس کی علامات ماضی میں امراض پھیلانے والے کورونا وائرسز سے ہی ملتی جلتی ہیں اور اس وقت جن افراد میں اس کی تصدیق ہوئی ہے ان میں سے بیشتر کو نمونیا جیسی علامات کا سامنا ہوا جبکہ کچھ میں زیادہ سنگین ردعمل بھی دیکھا گیا۔

۲۴ جنوری کو معتبر طبی جریدے دی لانسیٹ میں اس مرض کے کلینیکل فیچرز پر تفصیلی تجزیہ شائع کیا گیا تھا اور اس رپورٹ کے مطابق مریضوں میں درج ذیل علامات سامنے آسکتی ہیں:

بخار، جسمانی درجہ حرارت بڑھ جانا، خشک کھانسی، تھکاوٹ یا پٹھوں میں تکلیف، سانس لینے میں مشکل۔

اس کی کم نمایاں علامات درج ذیل ہیں:

کھانسی میں بلغم یا خون آنا، سر درد، ہیضہ۔

جب یہ مرض بڑھتا ہے تو مریضوں میں نمونیا کی تشخیص ہوتی ہے، جس میں پھیپھڑے ورم کے شکار اور پانی بھرنے لگتا ہے، اس کو ایک ایکسرے میں دیکھا گیا اور تحقیق میں شامل ۴۱ مریضوں میں اسے دیکھا گیا۔

کیا اس کا کوئی علاج موجود ہے؟

کورونا وائرسز کو بہت سخت جان جراثیم قرار دیا جاتا ہے، جو انسانی مدافعتی نظام میں موثر طریقے سے چھپ جاتے ہیں اور اب تک ان کے لیے کوئی قابل بھروسا طریقہ علاج یا ویکسین تیار نہیں ہوسکی ہے جو ان کا خاتمہ کرسکے، بیشتر واقعات میں طبی عملہ اس کی علامات پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔

آپ کی توجہ مطلوب ہے!

۱۔ گزارش ہے کہ جب آپ کا پتا تبدیل ہوجائے تو براہِ کرم ہمیں اس کی تحریری اطلاع مع نیا پتا بلا تاخیر بھیج دیا کریں، تاکہ پچھلے پتے پر جاکر پرچہ ضائع نہ ہو۔ اگر ہمارا لکھا ہوا پتا ادھورا یا غلط نظر آئے تو تصحیح میں ہماری مدد فرمائیں۔

۲۔ کسی صاحب کو ''معارف فیچر'' ان کی خواہش کے بغیر جاری ہوگیا ہو یا اب اسے لینا پسند نہ ہو تو گزارش ہے کہ براہِ کرم ہمیں اس کی اطلاع دینے کی زحمت ضرور کریں تاکہ پرچے کی ترسیل بند کی جاسکے۔

۳۔ یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ''معارف فیچر'' جاری ہوجانے کے بعد از خود بند نہیں کیا جاتا۔ اگر آپ میں سے کسی صاحب/ صاحبہ کو پرچہ بذریعہ ڈاک ایک بار بھی ملا ہو تو انہیں سمجھنا چاہیے کہ بعد میں بھی ان شاءاللہ ملتا رہے گا، تاآنکہ وہ خود منع کردیں۔ اگر پرچہ ملنا رُک گیا ہو تو اس کا سبب ترسیل کا بند ہونا نہیں، کچھ اور ہوسکتا ہے۔ مثلاً ڈاک والوں کی مہربانی یا پتا تبدیل ہوجانا۔ لہٰذا ''معارف فیچر'' بذریعہ ڈاک وصول کرنے والے اصحاب سے یہ گزارش بھی ہے کہ اس کے بند ہونے کی فوری تحریری اطلاع مع اپنے پورے نام اور مکمل و درست پتے کے ہمیں ضرور ارسال فرمائیں۔۔۔ ہم آپ کے تعاون، دعاؤں، مشوروں اور تبصروں کے لیے ممنون ہوں گے۔ (مدیر)

نوٹ:۔ زرِ تعاون اور عطیات کے چیک/ ڈرافٹ وغیرہ پر

Islamic Research Academy Karachi

لکھیے/لکھوایئے۔ براہِ کرم کراچی سے باہر کے بینک کا چیک نہ بھیجیے۔ خاصی رقم بینک چارجز کے نام سے کٹ جاتی ہے۔ خط و کتابت اور ترسیلِ زر کے لیے ہمارا پتا ہے:

D-35, Block-5, F.B. Area, Karachi - 75950, Tel: (92-21) 36809201, 36349840

عالمی ادارہ صحت کے ایمرجنسی پروگرام کے ایگزیکٹیو ڈائریکٹر مائیک ریان نے ایک پریس کانفرنس کے دوران بتایا تھا کہ کورونا وائرس کے حوالے سے کوئی طریقہ علاج موجود نہیں، کورونا وائرس سے متعلق وبا کے حوالے سے مریضوں کو مناسب نگہداشت خصوصاً نظام تنفس سپورٹ اور اعضا کی سپورٹ فراہم کی جاتی ہے۔

ایسا نہیں کہ ویکسین کی تیاری ناممکن ہے، چینی سائنسدانوں نے وائرس کے جینیاتی کوڈ کا سیکونس بنانے میں انتہائی تیزی سے کام کیا، جس سے سائنسدانوں کو اس حوالے سے تحقیق اور اس پر قابو پانے کے ذرائع پر غور کرنے کا موقع ملے گا۔

سی این این کے مطابق یو ایس نیشنل انسٹیٹوٹ آف ہیلتھ نے پہلے ہی ایک ویکسین پر کام شروع کر دیا ہے، مگر اسے متعارف کرانے میں ایک سال یا اس سے زیادہ وقت لگ سکتا ہے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ ۸ ہزار افراد کو متاثر کرنے والے سارس وائرس کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ یہ ایک مخصوص راستے پر چلتا ہے اور پھر لگ بھگ غائب ہو جاتا ہے، ایسی ویکسین نہیں جو اس وائرس کا خاتمہ کرے بلکہ ممالک کے درمیان موثر رابطے اور احتیاطی تدابیر اس کے پھیلاؤ کو روکنے میں مدد دیتی ہیں۔

ماہرین کے مطابق ہم یہ جان چکے ہیں کہ وبائی امراض کو ادویات یا ویکسین کے بغیر کنٹرول کیا جا سکتا ہے، جس کے لیے نگرانی کے عمل کو بڑھانے، مریضوں کو صحت مند افراد سے الگ کرنے، ان کے رابطوں کی ٹریکنگ، خطرے کے حوالے سے ذاتی احتیاط اور انفیکشن کنٹرول اقدامات سے مدد لی جا سکتی ہے۔

''معارف فیچر'' حاصل کرنے کے خواہشمند خواتین وحضرات اور اداروں سے گزارش ہے کہ اپنے نام اور پتے کے ساتھ (رضا کارانہ طور پر) =/۵۰۰ روپے کا ڈاک ٹکٹ یا کراچی کے کسی بینک کا اتنی مالیت کا چیک ''اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی'' کے نام ارسال کریں۔ آپ کا بینک بیرونِ کراچی ہو تو پھر بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر بھیجیں۔ زرِ خریداری موصول ہو جانے کے بعد آپ کے دیے ہوئے پتے پر ''معارف فیچر'' کی ترسیل شروع ہو جائے گی۔ ان شاء اللہ!

شرح اموات کس حد تک ہو سکتی ہے؟

اس وائرس سے دنیا بھر میں لوگوں کو ذہنی پریشانی کا سامنا ہوا ہے، مگر بظاہر یہ وائرس سارس جتنا جان لیوا نہیں، جس کے نتیجے میں ۲۰۰۲ء سے ۲۰۰۳ء میں ۷۷۴ ہلاکتیں ہوئیں۔ اور اموات کی شرح ۹٫۶ فیصد تھی جبکہ اس نئے کورونا وائرس کے شکار افراد کی تعداد سارس کے ۸ ماہ کی مجموعی تعداد سے ایک ماہ کے اندر ہی زیادہ ہو گئی مگر شرح اموات ۲ فیصد سے کچھ زیادہ ہے۔

درحقیقت چینی حکام نے بتایا ہے کہ اس وائرس کے شکار متعدد افراد صحت مکمل صحت یاب ہو چکے ہیں اور جو لوگ ہلاک ہوئے ہیں وہ یا تو بزرگ تھے یا دیگر بیماریوں کے شکار تھے جن کے باعث ان کا مدافعتی نظام کمزور ہو چکا تھا۔

طبی ماہرین کے مطابق اس حوالے سے لوگوں میں خدشات اور خوف پایا جاتا ہے مگر کچھ عناصر ہیں جو اس میں کمی لا سکتے ہیں، پہلا تو یہی ہے کہ اس کی تشخیص اور تعین بہت تیزی سے ہوا، درحقیقت اس کی دریافت کے ایک ہفتے بعد ہی چینی حکام نے وائرس کا سیکونس حاصل کر لیا تھا اور دنیا بھر کی لیبارٹریز سے شیئر کیا، ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

دوسری چیز طبی ٹیکنالوجی میں ۱۹۶۰ء کی دہائی میں کورونا وائرس کی دریافت کے بعد سے ہونے والی پیشرفت ہے جو لیبارٹریز اور وائرس کے ماہرین کو زیادہ گہرائی میں جا کر کام کرنے میں مدد دیتی ہے۔

ان کا کہنا تھا کہ صرف امریکا میں سیزنل فلو اس نئے کورونا وائرس سے زیادہ بڑا خطرہ ہے، جس سے گزشتہ ۴ ماہ میں کم از کم ڈیڑھ کروڑ امریکی شہری متاثر ہوئے جبکہ ۲۰ ہزار ہلاکتیں ہوئیں۔

آپ اس کے خطرے کو کیسے کم کریں؟

چین کے بعد متعدد ممالک میں اس کے کیسز سامنے آ چکے ہیں اور یہ ممکن ہے کہ ۲۰۱۹ء ناول کورونا وائرس مزید ممالک تک پھیل جائے۔ عالمی ادارہ صحت نے لوگوں کو اپنے تحفظ کے حوالے سے متعدد اقدامات کا مشورہ دیا ہے تاکہ اس سے بچ سکیں۔

اس مقصد کے لیے ہاتھوں اور نظام تنفس کی اچھی صفائی قابل ذکر ہے، آسان الفاظ سے ہر وہ کام جو آپ فلو یا نزلہ زکام کا خطرہ کم کرنے کے لیے کرتے ہیں، وہ اس کورونا وائرس سے بھی تحفظ فراہم کر سکتا ہے۔

یعنی اپنے ہاتھوں کو کم از کم ۲۰ سیکنڈ تک صابن اور پانی سے دھوئیں۔

گندے ہاتھوں سے منہ، آنکھوں اور ناک کو چھونے سے گریز کریں۔

کھانسی اور چھینک کے دوران اپنے منہ اور ناک کو ٹشو سے ڈھک لیں اور پھر اس ٹشو کو کچرے میں پھینک دیں۔

ایسے افراد سے ذرا دور رہیں جن میں سانس کے امراض جیسے کھانسی اور چھینکوں کی علامات نظر آئیں۔

جن چیزوں کو اکثر چھوتے ہیں، ان کی صفائی کا خاص خیال رکھیں۔

کچی یا ناقص طریقے سے پکی ہوئی غذا سے گریز کریں۔

اگر نزلہ زکام یا فلو جیسی علامات کے شکار ہیں تو بغیر کسی تاخیر کے ماسک کو پہن لیں اور ڈاکٹر سے مزید احتیاطی تدابیر کے بارے میں پوچھیں۔

(بحوالہ: روزنامہ ''ڈان'' کراچی۔ یکم فروری ۲۰۲۰ء)

سیرتؐ کے موضوع پر اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ کتاب

اوراقِ سیرت ﷺ

مولانا سید جلال الدین عمری

قیمت: ۴۰۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ فون: 021-36809201

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ کتاب

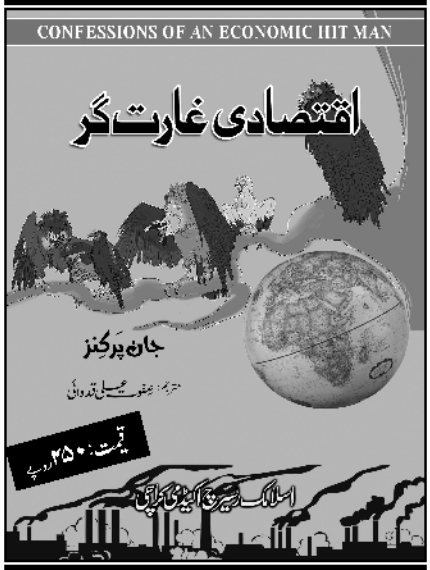

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5
فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ فون: 021-36809201

ڈونلڈ ٹرمپ کی 'صدی کی ڈیل' مذاکرات کا نقطہ آغاز؟

عبدالرحمان الراشد

امریکا کے صدر ڈونلڈ ٹرمپ کی نام نہاد ''صدی کی ڈیل'' پر ردعمل کوئی حیران کن نہیں۔ اسرائیلیوں نے اس کو ایک عظیم اقدام قرار دے کر قبول کرلیا ہے لیکن اس کی تفصیل منظر عام آنے تک توثیق نہیں کی ہے۔ فلسطینیوں کا مؤقف پیشگوئی کے عین مطابق تھا۔ انھوں نے اس کی تفصیل جاننے سے پہلے ہی اس کو مسترد کردیا۔ انھوں نے یہ شبہ ظاہر کیا ہے کہ یہ امن منصوبہ بنیامین نیتن یاہو کو جیل جانے سے روکنے کا حربہ ہوسکتا ہے۔

اسرائیل اور فلسطینیوں کے درمیان امن مذاکرات کے عمل کا آغاز ہوئے کئی برس گزر چکے ہیں۔ اس طویل عرصے کے دوران میں برسوں برسر اقتدار رہنے والے عرب نظاموں کا دھڑن تختہ ہو چکا ہے، لیبیا میں معمر قذافی اور عراق میں صدام حسین کی حکومت جاتی رہی، سوڈان اپنا آدھا حصہ گنوا بیٹھا، عمر البشیر معزول ہوگئے اور شام تباہ حال ہو چکا ہے۔

مشرق اوسط کے خطے کی دنیا کے توانائی کے بنیادی ماخذ کی حیثیت سے تزویراتی قدر کم ہوچکی ہے۔ اس کی وجہ امریکا کی تیل کی پیداوار میں اضافہ اور قابل تجدید توانائی ہے۔ خطے کے بعض لیڈر آج بھی پرانے محافظوں کی باقیات کے طور پر موجود ہیں لیکن وہ خطے میں رونما ہونے والی تاریخی تبدیلیوں کی عکاسی نہیں کرتے ہیں۔

اسرائیلی صرف فلسطینی کیس کو بند ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر انھیں مذاکرات کی میز پر بیٹھنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور مذاکرات شروع ہوتے ہیں تو بعض فلسطینی دھڑے، مثال کے طور پر ایران اور شام کے مسابقانہ مفادات پر سودے بازی یا مصالحت میں ناکام رہیں گے۔

اگرچہ اسرائیل اور فلسطین کے درمیان سابق امن معاہدوں پر بجا طور تنقید کی گئی تھی، مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ان معاہدوں سے جزوی طور ہی سہی فلسطینی مفادات کا تحفظ بھی ہوا تھا۔ ۱۹۹۳ء اور ۱۹۹۵ء میں اوسلو میں طے شدہ معاہدوں سے فلسطینیوں کو بین الاقوامی شناخت حاصل کرنے میں مدد ملی تھی۔ برسر زمین ان کا ایک انتظامی ادارہ وجود میں آیا تھا جبکہ اس سے پہلے تو ان کی تیونس میں ایک جلاوطن تنظیم ہی کام کر رہی تھی۔ اوسلو معاہدے کے نتیجے میں ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ فلسطینیوں کی اپنی آبائی سرزمین پر واپسی کی راہ ہموار ہوئی تھی۔

اس وقت اسرائیل کا سب سے اچھا اتحادی ایران ہے۔ ماضی میں ایران نے اپنے زیر اثر فلسطینی دھڑوں کے ذریعے اس بات کو یقینی بنایا تھا کہ قیام امن کے لیے تمام کوششیں ناکامی سے دوچار ہوجائیں۔ ایرانی امن مذاکرات میں اعتماد کی فضا کو نقصان پہنچانے کے لیے ان تھک کام کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے کاروں کے نیچے بم نصب کیے، اپنی گماشتہ ملیشیاؤں کے ذریعے طوائف الملوکی کو پھیلایا۔ مرحوم فلسطینی صدر یاسر عرفات کی قانونی حیثیت کے بارے میں سوال اٹھائے تھے۔

جب جب امن مذاکرات ناکامی سے دوچار ہوئے ہیں تو اس کے متاثرہ فریق ہمیشہ فلسطینی ہی رہے ہیں، ایرانی یا اسرائیلی نہیں۔ کسی معاہدے کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اسرائیل ہر روز فلسطینی اراضی پر قابض ہوتا رہا ہے اور فلسطینی علاقے سکڑتے چلے گئے ہیں۔

مذاکرات سے انکار کے پیچھے یہ دلیل کارفرما ہے کہ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ اسرائیل نواز ہیں، لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے تمام پیش رو صدور اسرائیل ہی کی طرفداری کرتے رہے ہیں لیکن اس کے باوجود فلسطینی اتھارٹی ان سے معاملہ کرتی رہی ہے۔ ٹرمپ کے اسرائیل سے متعلق فیصلوں میں برسر زمین حقیقت کو تسلیم کیا گیا ہے اور یہ سب فیصلے امریکا میں ووٹروں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے کیے گئے ہیں لیکن یہ بدستور غیر قانونی ہی ہیں۔

بین الاقوامی قانون کے تحت امریکی سفارت خانے کو یروشلم (مقبوضہ بیت المقدس) میں منتقل کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ پورا یروشلم ہی اسرائیل کا ملکیتی ہوگیا ہے۔ امریکی صدر کے اس اعلان کے باوجود کہ گولان کی چوٹیاں اسرائیل کا حصہ ہیں، انھیں اقوام متحدہ کے نقشوں میں شام کے مقبوضہ علاقے ہی سمجھا جاتا ہے (جن پر اسرائیل نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے)۔ ڈونلڈ ٹرمپ فلسطین کے لیے سب سے سنگین خطرہ نہیں ہیں۔ فلسطینی مفادات کو اس وقت سب سے بڑا خطرہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے کسی معجزے کے انتظار میں بیٹھ رہنے کے کردار سے درپیش ہے۔

فلسطینی صدر محمود عباس ہی شاید واحد شخصیت ہیں جو مذاکرات کی بحالی کے لیے نئی جنگ لڑ سکتے ہیں۔ وہ فلسطین کے تاریخی لیڈروں میں سب سے ضعیف العمر اور عقلیت پسند ہیں۔ اگر وہ نہیں ہوتے تو سولہ سال قبل یاسر عرفات کی وفات کے بعد فلسطینی اتھارٹی میں افراتفری پھیل چکی ہوتی۔

کیا صدر ٹرمپ کی مذاکرات کی دعوت کو قبول کرنے کا یہ مطلب ہے کہ فلسطینی اتھارٹی کو جو کچھ پیش کیا جائے گا، وہ اس کو من وعن قبول کرلے گی؟ اس کا جواب یقینی طور پر نہیں ہے۔ اس کا مطلب مذاکرات کی میز پر بیٹھنا اور تعمیری مکالمے کا آغاز کرنا ہے۔ فلسطینی اگر کوئی حل نہیں چاہتے تو کوئی بھی ان پر وہ حل مسلط نہیں کر رہا ہے۔ اسرائیلی بھی موجودہ جوں کی توں صورت حال کو تبدیل کرنے میں متردد ہوں گے کیونکہ اس سے بظاہر انھیں زیادہ اراضی اور فلسطینیوں پر اختیار حاصل ہے۔ وہ ٹرمپ کو اپنا حامی خیال کرتے ہیں۔ ایک ایسا دوست، جو شاید دوبارہ منتخب ہوجائے اور بہت زیادہ طاقت واختیار حاصل کرلے، جس کو اسرائیلی اپنے مفاد میں خوب استعمال کرسکتے ہیں یا اس کے ذریعے اور کچھ نہیں تو اپنے لیے خطرات ہی کو کم کرسکتے ہیں۔

اس لیے اب اس بات کی زیادہ اہمیت ہے کہ فلسطینی موقع سے فائدہ اٹھائیں اور مذاکرات کا آغاز کریں۔ وہ اپنے مفاد میں موقع تلاش کریں، قبل اس کے کہ تاریخ کوئی فیصلہ ثبت کردے اور یہ ضروری نہیں کہ یہ فیصلہ ان کے حق ہی میں ہو۔

عبدالرحمان الراشد العربیہ کے ادارتی بورڈ کے چیئرمین ہیں۔

(بحوالہ: ''العربیہ ڈاٹ نیٹ''۔ ۳۱ جنوری ۲۰۲۰ء)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی شائع کردہ کتاب

عالمی مسائل کے تناظر میں

پاکستان کی خارجہ پالیسی

پروفیسر ڈاکٹر سید صلاح الدین احمد

قیمت: ۴۰۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5
فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی۔ فون: 021-36809201

MA'ARIF FEATURE • Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950